پیغمبر اسلام ﷺ
اور
تجارت
مؤلف
جناب حکیم محمود احمد ظفر
بیت العلوم

پیغمبر اسلام ﷺ اور تجارت

مؤلف

جناب حکیم محمود احمد ظفر

بیت العلوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب

پیغمبر اسلام اور تجارت

مؤلف

جناب حکیم محمد یوسف مظہر

باہتمام

مولانا محمد ناظم اشرف

ناشر

بیت العلوم

فہرست

﴿تقدیم﴾

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا

﴿طلب الحلال فریضة بعد الفریضة﴾

[مجمع الزوائد ۱۰/۲۹۱، معجم کبیر طبرانی رقم ۹۹۹۳]

"حلال روزی طلب کرنا فرائض کے بعد ایک فریضہ ہے۔"

حلال روزی کئی طریقوں سے کمائی جا سکتی ہے۔ زراعت سے بھی، محنت مزدوری اور ملازمت سے بھی اور تجارت سے بھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں افضل ذریعہ معاش کون سا ہے؟ بعض نے زراعت کو افضل کہا ہے اور بعض نے اجارہ کو اور اکثریت کی رائے یہ ہے جس میں امام شافعیؒ اور فقہ کے احناف بھی شامل ہیں، کہ تجارت سب سے افضل ذریعہ معاش ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب ؓ نے بھی فرمایا ہے کہ

﴿علیکم بالتجارة لا تفتنکم هذه الحمراء علی دنیاکم﴾ [التراتیب الاداریة ۲/۲۰۳]

"تجارت کو اختیار کرو۔ یہ سرخ لوگ یعنی عجمی غلام تمہاری اس دنیا پر تمہارا اقتصاد نہ اپنا لیں۔"

رسول اللہ ﷺ نے خود تجارت فرمائی، شراکت پر بھی مضاربت پر بھی۔ آپ کے خلفاء کی اکثریت تجارت کرتی تھی۔ سیدنا ابوبکر ؓ تو زمانہ جاہلیت میں بھی ایک معروف تاجر تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں آپ (سیدنا ابوبکرؓ) بصریٰ تجارت کے لیے تشریف لے گئے اور رسول اللہ ﷺ کا عاشق زار ہوتے ہوئے بھی تجارت کے لیے گئے اور چند دنوں کے لیے آپ کی جدائی کو مشکل سے برداشت فرمایا۔ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ سیدنا ابوبکر ؓ خلیفہ ہوئے تو دوسرے روز بجائے امور خلافت نمٹانے کے لیے دربار خلافت میں جاتے، آپ ہاتھ پر کپڑے کے تھان رکھے بازار کی

جات چونکہ خوب صورت، نفیس اور قیمتی ہوتے ہیں، اسی وجہ سے اہلِ جنت کا لباس بھی حریر، ریشم کا ہوگا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے

وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ (الحج: ۲۳)

''اہلِ جنت کا لباس جنت میں حریر اور ریشم کا ہوگا۔''

مکہ میں مختلف لوگ مختلف چیزوں کی تجارت کرتے تھے۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ گوشت اور لوہے کی تجارت کرتے تھے۔ عرب میں کسی بھی کاروبار میں کوئی عار نہ سمجھی جاتی تھی (اور اسلام کا بھی یہی اصول ہے۔) بلکہ ہر کام ان کے نزدیک باعث عزت و شرف تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اس معاشرہ میں دیبا، ریشم کے کپڑوں کا کام کرنا ان کی طبیعت کی نفاست، خوش مذاقی، دور بینی اور احتیاط پسندی کی غمازی کرتا ہے۔ آپ ایک طرف تو صاحب شمشیر و سنان تھے اور جنگی مہارت و قابلیت میں نہایت اعلیٰ تھے، اور دوسری طرف ریشم کی طرح نرمی بھی آپ کی طبیعت میں موجود تھی جس کا اظہار کئی مواقعوں پر ہوا۔ چنانچہ جب مسلمانوں کی امارت کی ذمہ داری ان کو سونپی گئی تو آپ نے سب سے پہلی دعا جو بارگاہ رب العزت میں کی، وہ کچھ یوں تھی:

''اے اللہ! میں سخت ہوں مجھے نرم کر دے، اے اللہ! میں کمزور ہوں مجھے طاقت دے، اے اللہ! میں بخیل ہوں مجھے سخی بنا دے۔''

مختصر یہ کہ آپ ایک بہترین تاجر بھی تھے۔ چنانچہ کئی محدثین نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے علاوہ اور کوئی موقع ایسا نہیں جس میں مجھے موت آ جانا اس سے زیادہ محبوب ہو کہ میں اپنی محنت اور کوشش سے روزی حاصل کر رہا ہوں، یعنی اس موقع پر موت آ جانا جہاد کے علاوہ اور تمام مواقع سے بہتر ہے۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بھی ایک بہت بڑے تاجر تھے، ان کے تاجر ہونے کو تو ہر شخص بخوبی جانتا ہے۔ دونوں زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں میں تاجر تھے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب سیرت سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ)

غریب کے بچے رات کو بھوکے پیٹ سوتے ہیں۔

اس نظام معیشت کے مقابلہ میں اسلام نے اپنا ایک نظام معیشت و اقتصاد دیا ہے جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب "معیشت و اقتصاد کا اسلامی تصور" میں دی ہے۔ لیکن مغربی طاقتیں اس نظام کو نافذ نہیں ہونے دے رہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت نے تجارت میں جو خرابیاں پیدا کی ہوئی ہیں اجمالی طور پر ہم نے ان کو بھی بیان کیا ہے۔

مغربی معاشیات میں انسان دوسرے جانوروں کی طرح ایک جانور اور حیوان ہے جو اپنے جبلی داعیوں کے تحت اعمال حیات انجام دیتا ہے، لہٰذا جو اصول و قوانین دوسرے حیوانات اور جانوروں پر لاگو ہوتے ہیں وہی قوانین ایک انسان کی زندگی پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی معاشیات میں انسان کے بارے میں یہ تصور نہیں ہے کہ وہ دوسرے حیوانوں کی طرح ایک حیوان ہے بلکہ اسلام کے نظام معیشت میں انسان کے بارے میں تصور یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے۔ یہ بندر جیسے حیوان سے ترقی کرکے انسان نہیں بنا بلکہ اللہ تعالیٰ نے خاص اہتمام سے اس کو انسان ہی پیدا کیا اور اس کی فطرت میں اپنی پاکیزہ روح پھونکی۔ اس وجہ سے اس کائنات ارضی میں اس کا مرتبہ اور مقام دوسری تمام مخلوق سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اسے دنیا میں اپنے خالق کی مرضیات اور احکامات نافذ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے، اس لیے اسے روٹی اور روزی کے لیے ذلیل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی غلامی کی زنجیروں سے اسے جکڑا جا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ چیز بھی ذہن میں رہے کہ مغربی اور غیر اسلامی معاشیات میں جس کا موجودہ دنیا میں اکثر و بیشتر بلکہ تمام ممالک میں چلن ہے، حیوانی انسان کے اندر ایک معاشی انسان (Economic Man) کی موجودگی کا تصور دیتی ہے جس کی فطرت کا خمیر خود غرضی، حرص و آز اور خود پرستی سے تیار ہوا ہے۔ اپنی اس جبلت اور فطرت کی وجہ سے یہ معاشی انسان ہر معاملہ میں اپنے ذاتی مفاد کے لیے کوشاں اور اپنے وسائل سے زیادہ سے زیادہ تسکین حاصل کرنے اور زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لیے سرگرم اور بے قرار رہتا

ہے۔ اس کے قواعد فطری تقاضے جیسے منفعت و مسرت اور دفع مشقت و الم کے احساسات کے تحت حرکت کرتے ہیں۔ فطرت انسانی کا یہ تصور معاشرہ کے افراد میں خود غرضانہ، مفاد پرستی اور زیادہ سے زیادہ جلب منفعت کے احساسات کو ابھار دیتا ہے اور ایثار، ہمدردی، رحم دلی اور باہمی معاونت کے جذبات سے ایک انسان کو یکسر محروم کر دیتا ہے۔ جس نظام کے تحت انسان کے ان جذبات و احساسات اور اس کو وحشی اور حیوانی انسان سمجھتے ہوئے معاملہ کیا جائے اس نظام کو سرمایہ دارانہ نظام کہا جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی ستون جس کے ذریعے یہ نظام غریبوں کا خون نچوڑ رہا ہے وہ سود ہے جو اسلام میں تو حرام ہے لیکن قریباً ہر مسلمان ملک میں اس کو تجارت کا جزو لاینفک بنا دیا گیا ہے۔ اس پر بھی ہم نے اس کتاب میں اجمالی طور پر بحث کی ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ سودی کاروبار اور تجارت سے ملک کی دولت میں ترقی ہوتی ہے لیکن یہ محض فریب نظر اور دھوکہ ہے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم کا فیصلہ ہے:

﴿يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾ (بقرہ: ۲۷۶)

"اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔"

مختصر یہ ہے کہ شریعت میں تجارت سب سے افضل ذریعہ معاش ہے لیکن اس کی راہ میں بہت سے خطرات ہیں۔ اس لیے ایک تاجر کے لیے شریعت کے مسائل کا جاننا ضروری ہے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ جو خرید و فروخت کے مسائل کو نہ جانتا ہو وہ ہمارے بازار میں نہ بیٹھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو یہ کہہ کر بازار بھیجا کہ جو خرید و فروخت کے احکام کو نہ جانتا ہو اس کو بازار سے نکال دے۔

حضرت امام مالکؒ نے بھی اس شخص کو بازار سے نکلوا دینے کا حکم فرمایا تھا جو احکام نہ جانتا ہو تاکہ مسائل نہ جاننے کی وجہ سے لوگوں کو سود نہ کھلا دے۔ اور کنز العمال میں مرفوعاً منقول ہے کہ ہمارے بازاروں میں صرف وہی آدمی خرید و فروخت کیا کرے جو دینی مسائل جانتا ہو۔

تاتارخانیہ میں فتاویٰ حجہ سے نقل کیا گیا ہے کہ کسی شخص کا تجارت میں مشغول

ہوتا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ وہ یہ نہ جان لے کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے؟

امام محمد سے ایک مرتبہ لوگوں نے عرض کیا کہ آپ تصوف کے بارے میں ایک کتاب لکھ دیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے "بیوع" (خرید و فروخت) کے بارے میں ایک کتاب لکھ دی ہے۔ اس کتاب کے مسائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب کوئی شخص خرید و فروخت کرے گا اور ناجائز اور حرام سے بچے گا تو متقی ہوگا۔ اس کا کسب حلال ہوگا اور عمل اچھا ہوگا۔ [احیاء ج ۲ ص ۸۲]

مختصر یہ کہ تجارت کے افضل ہونے میں تو کوئی شک نہیں لیکن تجارت کے مسائل کا جاننا بھی ضروری ہے تاکہ صحیح طریقے سے تجارت کر سکے۔ جھوٹ نہ بولے، قسمیں نہ کھائے، کسی کو خرید و فروخت میں دھوکہ نہ دے۔ اگر وہ ان ہدایات پر عمل کرے گا تو قیامت کے روز انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ اٹھے گا جیسا کہ بتایا گیا ہے۔ لیکن حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ قرب قیامت میں مال و دولت کی حرص کی وجہ سے لوگوں میں حرام و حلال کی تمیز ختم ہو جائے گی اور ہر شخص کا مقصد زندگی صرف مال اکٹھا کرنا رہ جائے گا خواہ حلال طریقے سے اکٹھا ہو یا حرام طریقہ سے، جب کہ اسلام نے مال کے کمانے اور خرچ کرنے دونوں پر پابندی لگائی ہے۔ ترمذی

ایک حدیث میں ہے کہ

لیأتین علی الناس زمان، لا یبالی المرء بما اخذ المال، أمن حلال أم من حرام؟ [بخاری: ۲۔ ۳۱۳]

"لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ آدمی اس بات کی کوئی پروا نہیں کرے گا کہ وہ حلال طریقے سے مال کما رہا ہے یا حرام طریقے سے۔"

بہرحال اس کتاب میں پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں تجارت پر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دورِ جاہلیت

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل کے دور کو جاہلیت کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن دورِ جاہلیت سے مراد وحشت و جہالت کا دور نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی بعثت سے قبل عرب قوم وحشی تھی جو تہذیب و تمدن سے نا آشنا اور علم و ہنر سے بے بہرہ تھی، نہ اس میں کوئی شرافت تھی نہ تہذیب، نہ ان کا کوئی خاص ادب تھا اور نہ سلیقہ۔ یہ بات بدوی قبائل کے بارے میں تو کہی جا سکتی ہے اور جیسے بدوی قبائل کسی ملک اور قوم کی تہذیب کا معیار نہیں مانے جاتے۔ بدوی قبائل کے علاوہ مکہ، طائف، یثرب اور دومۃ الجندل جیسے شہروں کے متعلق یہ تصور اور یہ خیال سراسر زیادتی ہے۔

اس زمانہ میں دو سپر پاورز (Super Powers) تھیں۔ ایک ایرانی سلطنت اور دوسری بازنطینی حکومت۔ لیکن تاریخ کے ریکارڈ بتاتے ہیں کہ اگرچہ عربوں کے پاس ان کی طرح مضبوط قلعے اور سونے چاندی کے ذخیرے نہ تھے لیکن صبر و استقلال، پامردی اور استقامت، جفاکشی اور محنت کوشی اور سب سے بڑھ کر گھوڑوں کی پیٹھ اور تلوار ان کا بہترین سرمایہ تھا۔ ان کی اپنی ایک تہذیب تھی، ایک تمدن تھا، ایک ادب تھا اور ایک ثقافت تھی جس کی وجہ سے وہ تمام دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ صرف انہی کو پوری دنیا میں یہ حق حاصل تھا کہ وہ خالص النسل اور محفوظ النسب ہونے کا دعویٰ کریں۔ ان کی عورتیں با عصمت تھیں۔ ان کے نہ صرف اپنے نسب محفوظ تھے بلکہ انہیں اپنے گھوڑوں اور اونٹوں تک کے نسب بھی ازبر تھے۔ نظم و نثر اور خطابت و تقریر میں انہیں تمام دنیا میں ایک امتیاز حاصل تھا، اور دنیا کی کوئی قوم اس بارے میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے اونٹ ان کے صحرا کے جہاز تھے اور ریت کے سمندر کے سینہ پر ان کے یہ جہاز رینگتے اور مشرق کی آخری

"یعنی ہم سخاوت کی وجہ سے (مہمانوں کے لیے) گوشت کے ٹکڑے کاٹتے ہیں اور دشمن قوموں کی ہنڈیاں مذمت کے ساتھ جوش مارتی ہیں (بخل کی وجہ سے)۔"

و یحلب ضرس الضیف فینا اذا شتا

سدیف السنام تستریه اصابعه

"یعنی جب مہمان موسم سرما میں ہمارے پاس آجائے تو اس کی ڈاڑھ کوہان کی چربی کو نکالتی ہے جس کو اس کی انگلیاں چنتی اور اختیار کرتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم مہمان کی خاطر مدارات اس طرح کرتے ہیں کہ کوہان کے پارچے اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں، اور جب وہ کھاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ڈاڑھیں دودھ دوھ رہی ہیں اور کوہان کی اس بوٹی سے دودھ کی دھاریں پھوٹ رہی ہیں۔"

عربوں کے ہاں سب سے بڑی بیماری بخل اور کنجوسی تصور کی جاتی تھی۔ چنانچہ مقولہ ہے

وایّ داء ادوأ من البخل (بخاری ۲۰۱:۲۲)

"بخل سے زیادہ خراب اور کونسی بیماری ہے۔"

بعثت نبوی ﷺ سے قبل دنیا کا نظام معیشت

یہ تو جزیرہ نما عرب کی چند خرابیوں کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے علاوہ آپ کی بعثت سے قبل دنیا کے ہر ملک پر "جاہلیت اولیٰ" کے بادل چھائے ہوئے تھے، اور چھٹی صدی عیسوی تاریخ انسانی کا ایک سیاہ ترین اور پست ترین دور تھا۔ انسانیت روز بروز پستی اور نشیب کی طرف جا رہی تھی اور ساری دنیا میں کوئی ایسی طاقت نہ تھی جو انسانیت کی اس گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیتی اور اسے ذلت و پستی کے گڑھے میں گرنے سے روکتی۔ اس خدا ناآشنا اور خدا فراموش معاشرہ میں ہر انسان مکمل طور پر خود فراموش تھا۔ اسی وجہ سے تمام

فروختگی"۔ (حجۃ اللہ البالغہ، باب اقامۃ الارتفاقات؛ علاج الرسوم ۱/۲۰۲)

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ان دونوں میں یعنی دونوں میں سرمایہ دارانہ نظام معیشت تھا کیونکہ یہ عیاشی اور بے مقصد خرافات اور قیمتی سواریاں اسی نظام معیشت کے برگ و بار ہیں۔ اس وقت جزیرہ نمائے عرب ہی ایک ایسا مقام تھا جو اس نظام سے عاری تھا کیونکہ ان لوگوں کی خصلتیں سرمایہ دارانہ نظام کے بالکل خلاف تھیں کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں بخل اور شح ہوتا ہے جو عربوں میں نہیں تھا۔ ان کے ہاں تو یہ دستور تھا کہ رات کے وقت وہ اونچے اونچے ٹیلوں پر آگ جلا دیا کرتے تھے تاکہ اگر رات کے وقت کسی مسافر کا وہاں سے گزر ہو تو وہ اس آگ کو دیکھ کر یہاں کے لوگوں کے خیموں تک پہنچ سکے اور جب کوئی بھولا بھٹکا مسافر رات کے وقت ان کے پاس پہنچ جاتا تو وہ اس کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔ حضرت سید محمود بغدادی نے اس بارے میں دو شعر نقل کیے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

> "ایک آقا اپنے غلام سے کہتا ہے: اے واقد! اونچے ٹیلے پر آگ جلا کیونکہ رات نہایت سرد ہے اور ہوا بھی ٹھنڈی اور تیز چل رہی ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی بھٹکا ہوا مسافر تیری آگ کو دیکھ لے۔ اگر تیری اس جلائی ہوئی آگ نے کسی مہمان کو اپنی طرف کھینچ لیا تو تو آزاد ہوگا۔" (بلوغ الارب ۱/۸۶)

کبھی کبھی یہ لوگ بجائے آگ جلانے کے عود اور دوسری خوشبودار چیزیں جلاتے تاکہ وسیع و عریض صحرا میں ہوا کے جھونکے اس کو دور دور تک پھیلا دیں اور مسافر اس خوشبو کو سونگھ کر ان کے پاس پہنچ جائیں اور وہ اس کی ضیافت کر کے لطف اندوز ہوں۔ بعض لوگوں نے اس مقصد کے لیے کتے پال رکھے تھے جو رات کی خاموشی اور سناٹے میں بھونکتے اور دور دراز تک ان کی آوازیں شب کے صحرا نوردوں اور رات کے مسافروں کو ان کے خیموں تک پہنچا دیتیں، اور وہ ان کی مہمان نوازی کر کے اپنی روح کو سکون بخشتے۔ چنانچہ ایک شاعر اپنے بیٹے کو یوں وصیت کرتا ہے:

حکومت چھٹی صدی عیسوی میں تھی۔ اس نے اپنی سگی بہن سے اپنا ازدواجی تعلق رکھا۔

(ہجری ازدھ ۵۰۹)

مشہور محقق سینٹ جون سیانگ کا بیان ہے کہ ایرانی قوانین معاشرت میں ازدواجی تعلقات کے لیے کسی رشتہ کا بھی استثنا نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ماں، بہن اور بیٹی ان سب سے ازدواجی تعلقات قائم کرنا ایرانی معاشرت کا ایک اصول تھا۔ (ایران بعہد ساسانیاں ص ۴۳۱) پروفیسر آرتھر کرسٹن سن کے بیان کے مطابق اس قسم کا ازدواجی رشتہ ایران میں کوئی ناجائز یا حرام فعل تصور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایک کار ثواب سمجھا جاتا تھا۔ گویا ذہن و فکر میں اس قدر انقلاب آچکا تھا کہ حلال و حرام کا تصور ذہنوں سے بالکل ختم ہو گیا تھا۔

محرمات سے نکاح زرتشتیوں کا مذہب تھا لیکن ان کے علاوہ عیسائی اور دوسرے مذاہب کے پیروکار جو ایرانی سلطنت میں بستے تھے انہوں نے بھی اس فعل بد کو اپنا لیا۔ چنانچہ پروفیسر آرتھر لکھتا ہے۔

"ایران کے عیسائیوں نے بھی زرتشتیوں کی دیکھا دیکھی محرمات کے ساتھ شادی کرنے کے فعل بد کو اپنا لیا حالانکہ ان کی شریعت میں یہ فعل حرام تھا۔" (ایران بعہد ساسانیاں ص ۳۵۵)

پھر ساسانیوں میں یہ رواج بھی عام ہو گیا کہ وہ اپنی عورتیں دوسروں کو استعمال کے لیے دے دیتے تھے اور ان سے جو اولاد ہوتی وہ اس شوہر کی سمجھی جاتی تھی جو اپنی عورت دوسرے کو دیتا تھا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ایران بعہد ساسانیاں ص ۳۴۸ ۔ ۳۵۱)

تیسری صدی عیسوی میں ایک شخص مانی ایران کی سرزمین میں پیدا ہوا۔ اس نے ملک میں شدید شہوانی رجحانات کے رد عمل کے طور پر ایک تحریک چلائی اور اس نے دنیا کو تجرد کی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی تاکہ دنیا سے شر و فساد اور جنسیت کے جرائم یکسر ختم ہو جائیں۔ چنانچہ اس نے نکاح کو حرام قرار دے دیا۔ بہرام نے ۲۷۶ء میں مانی کو یہ کہتے ہوئے موت کے گھاٹ اتار دیا کہ یہ شخص دنیا کو تباہی کی دعوت دیتا ہے۔ لہٰذا قبل اس کے کہ یہ دنیا ختم ہو، خود اس شخص کو ختم ہو جانا چاہیے۔

پھر ۴۸۷ء میں مزدک پیدا ہوا۔ اس نے یہ دعوت دی کہ تمام انسان یکساں پیدا ہوئے ہیں مال ملکیت میں تفریق کیسی لہٰذا زن، زر اور زمین سب کی مشترک ہے۔ گویا دنیا میں سب سے پہلا (یوٹوپیائی) سوشلسٹ تھا جس نے ان تینوں کو ہر ایک کے لیے مشترک قرار دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ چونکہ مال اور عورت ہی دو ایسے عنصر ہیں جن کی حفاظت و نگرانی کا انسان اہتمام کرتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں میں اشتراک اور مساوات سب سے زیادہ ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ شہرستانی نے لکھا ہے۔

> "مزدک نے تمام عورتوں کو سب کے لیے حلال قرار دے دیا اور مال و دولت کو آگ، پانی اور چارہ کی طرح سب کے لیے مشترک قرار دیا۔" الملل والنحل ص ۱۸۰

مزدک کی اس دعوت میں بڑی جاذبیت تھی کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں جنسیت کو فروغ دینا نوجوان نسل کے لیے ایک قوت ہوتی ہے لہٰذا مزدک کی اس دعوت کو نوجوان نسل اور عیش پسند امراء اور اعیان سلطنت نے بھرپور طریقے سے قبول کیا اور اس تحریک کو بڑا جوش اور بھرپور خیر مقدم کیا اور یہ تحریک چند سالوں میں جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی۔ اس پر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ ایرانی بادشاہ قباذ نے اس تحریک کی سرپرستی کی بلکہ اس کی اشاعت میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں پورا ملک آج کل کے یورپ اور امریکہ کی طرح جنسی آزادی اور شہوانی بحران میں ڈوب گیا۔

علامہ طبری نے لکھا ہے۔

> "آوارہ مزاج اور اوباش قسم کے لوگوں نے اس تحریک کی بڑی پذیرائی کی اور اس موقع کو غنیمت سمجھا اور مزدک اور مزدکیوں کے پرجوش ساتھی بن گئے۔ عوام شہری اس بلائے ناگہانی کا شکار تھے یہاں تک کہ ان میں سے کسی کی بھی عزت محفوظ نہ تھی۔ اس تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ جو چاہتا اور جس کے گھر میں چاہتا گھس کر اس کے مال و زن پر قبضہ کر لیتا اور صاحب خانہ منہ تکتا رہ جاتا۔ ان مزدکیوں نے قباذ

کو معتزلی کی دھمکی دے کر اس تحریک کا سرپرست بنا لیا۔ بادشاہ کی سرپرستی سے اس تحریک میں اور زور و شور پیدا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ حالت ہوگئی کہ نہ باپ اپنی لڑکیوں کو پہچان سکتا تھا اور نہ لڑکا اپنے باپ کو، کسی کا بھی اپنی کسی ملکیت اور عورت پر اختیار اور قبضہ نہ تھا۔" (طبری ۱/۸۷۵)

یہ تو ایرانی اخلاقیات کا ایک سرسری نقشہ تھا۔ عقیدہ کے لحاظ سے بھی ایران کی حالت روم سے زیادہ بدتر تھی۔ ایرانیوں کی بھی یہ حالت تھی کہ بجوش بت شکنی میں انہوں نے مصریوں کے متبرک بیل اپیس (Apis) کو ذبح کر ڈالا تھا اور اس کے استھان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، لیکن انہوں نے بہت جلد خود ہر مزکی پرستش میں اپنے مجسم ملکوں کے سائی خداؤں کو داخل کر لیا۔ پرانی مجوسی عناصر پرستی از سرنو تازہ ہوگئی اور دارا یوش کے ایک قریبی جانشین ارد شیر نیمون (ARTOXERXCES MNEMON) نے زرتشتیوں میں مخنث دیوتا متھرا کی پوجا رائج کر دی۔ یہ قدیم زنی دیوتا ملتا یا انائی تیس کا شی تھا۔ اس کے ساتھ لنگ پوجا بھی وابستہ تھی۔

ایران کے بادشاہ اس بات کے دعویدار تھے کہ ان کی رگوں میں خدائی خون ہے۔ لہٰذا ایران کے باشندے بھی انہیں اسی نظر سے دیکھتے اور ان کے آگے سربسجود ہوتے اور انہیں قانون سے تنقید سے اور بشریت سے بالاتر تصور کرتے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ بادشاہت ان کا آسمانی حق ہے (Divine Right of Kings)۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر براؤن کی کتاب (Literary History of Persia Vol. iv) ان سلاطین کا ہر انسان پر پیدائشی حق تھا، لیکن کسی دوسرے انسان کا ان پر کوئی حق نہ تھا۔ حکومت کے لیے صرف ایک خاص خاندان یعنی کیانی خاندان مخصوص تھا۔ لہٰذا سمجھا یہ جاتا تھا کہ اسی خاندان کے افراد تاج و تخت کے مالک ہو سکتے ہیں، اور بادشاہت کا یہ حق ان کا موروثی اور الٰہی ہے۔ اگر انہیں خاندان میں بادشاہت کے لیے کوئی سن رسیدہ شخص نہ ملتا تو کسی عورت یا بچے ہی کو تاج شاہی پہنا دیتے۔ چنانچہ کسریٰ کی لڑکی پوران اور دوسری بیٹی آذری دخت

مظالم شروع کر دیے۔ ان کے مذہبی شعائر کی توہین کی گئی۔ ایک لاکھ عیسائیوں کو بے گناہ قتل کیا گیا۔ کلیساؤں کو مسمار اور آتش کدوں کو تعمیر کیا گیا اور ان کی مقدس صلیب کی بعض لکڑی جس کے بارہ میں عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے اس پر جان دی تھی، چھین کر ایرانی دارالسلطنت مدائن پہنچا دی گئی۔

اس وقت ایرانی فاتح اپنے آپ کو کیا سمجھتا تھا اس کا اندازہ خسرو پرویز کے اس خط سے ہوتا ہے جو اس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا تھا:

Khusru greatest of gods Master of the whole earth to Heraclius. His vile and insensate slave. You say that you trust in your god. Why then has he not delivered Jerusalen out of my hand.

سب خداؤں سے بڑے خدا اور تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام۔ تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے کیوں نہ تیرے خدا نے یروشلم کو میرے ہاتھوں سے بچا لیا۔

اس خط کے ایک ایک لفظ سے ایرانی بادشاہ کی رعونت، تکبر اور غرور و جاہ ٹپکتا ہے۔ اسی دوران ایرانی جنرل سین (SAIN) نے تجویز کیا کہ ہرقل صلح کا ایک قاصد شاہ ایران کی خدمت میں روانہ کرے۔ اس کو ہرقل اور اس کے مشیروں نے بڑی خوشی سے قبول کیا، لیکن شاہ ایران نے کہا:

”مجھ کو یہ قبول نہیں بلکہ خود ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے چاہیے۔ رومی حکمران سے اس وقت تک صلح نہیں کروں گا جب تک وہ اپنے صلیبی خدا کو چھوڑ کر سورج دیوتا کی پرستش نہ کرے۔“

The History of the Defline and Fall of the Roman Empire, vol 5, P 75, By Edward Gibbon)

خسرو کے اس خط کو تمام مورخین نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے بلکہ دربار ایران

نے بھی اپنی مشہور کتاب The Age of Faith کے صفحہ 147 اور جنرل
پرسی نے اپنی کتاب History of Persia کے صفحہ 482 پر بھی نقل کیا ہے۔
حکومت کی طرف سے عوام الناس کو ممانعت تھی کہ وہ امراء کے طبقہ میں سے کسی
کی جائیداد خرید سکیں۔ سوسائٹی میں مختلف طبقات میں ناقابل عبور فاصلہ تھا۔ ذات پات کا
تصور عام تھا۔ کوئی بڑا کام نچلی ذات کے آدمی کے سپرد نہیں کرتے تھے اور سوسائٹی میں ہر
شخص کی ایک متعین جگہ تھی۔ اس وجہ سے کوئی شخص ترقی کر کے اوپر نہیں جا سکتا تھا۔

(ملاحظہ ہو ایران بعہد ساسانیاں)

وطن پرستی اور قوم پرستی ایرانیوں کی گھٹی میں تھی۔ وہ ایرانی قومیت کو نہایت مقدس
اور باعظمت سمجھتے تھے۔ گویا "خانہ ما پارسی و ایمان پرستمد" ان کا عقیدہ تھا۔ اس عقیدے کا نتیجہ یہ
ہوا کہ وہ اپنے گردو پیش کی قوموں کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ
خسرو پرویز نے سرکار دو عالم ﷺ کے نامہ مبارک کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا جو کہ
توہین و تمسخر کی ایک بھونڈی مثال ہے۔

جب عقیدے کی یہ حالت ہو تو اس معاشرے میں ایک جامع دین کیسے راہ پا سکتا
ہے۔ اسی وجہ سے ایرانی دین الہٰی سے محروم تھے جو ان کے باطن کی اصلاح کرتا۔ یہ تھے مختصر
سے حالات اس سلطنت کے جس کا بادشاہ اپنے آپ کو سب خداؤں سے بڑا خدا اور تمام
روئے زمین کا مالک سمجھتا تھا۔ اگرچہ ان کی سلطنت میں اس زمانہ کی تہذیب و تمدن کی ہر شے
موجود تھی لیکن سلطنت کا پورا نظم جاہلی بنیادوں پر قائم تھا۔ اور اسلام نے اسی کو "جاہلیت"
کہا ہے۔ گو کہ ایرانی سلطنت کے پاس جدید سے جدید اسلحہ اور ہر قسم کا سامان تعیش موجود تھا
لیکن وہ انسانی اقدار موجود نہ تھیں جن پر انسانیت کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور جن کے سایہ دار
درخت کے نیچے انسان سکھ کا سانس لیتے ہیں۔

ایران کے معاشرتی حالات بھی نہایت خراب تھے۔ ایرانی معاشرہ مختلف طبقات
میں منقسم تھا۔ سوسائٹی میں چھوٹے بڑے کا امتیاز اس قدر تھا کہ چھوٹے لوگ معاشرہ میں
کوئی اونچا مقام حاصل کر لیں تو یہ بہت بڑی بات تھی۔ وہ اپنا پیشہ تک تبدیل نہیں کر سکتے

تھے۔ ان کے ذہنوں میں مذہبی طبقہ کی طرف سے یہ بات ڈالی جاتی تھی کہ تمہارے آباؤ اجداد نے جو پیشہ اختیار کیا تھا وہ خدا کے حکم کے تحت کیا تھا، لہٰذا اب انہیں پیشہ تبدیل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ایران کی اعلیٰ سوسائٹی کی عمارت دو ستونوں پر قائم تھی۔ ایک نسب اور دوسرا مال و دولت۔ چنانچہ عوام اور خواص کے مابین لباس، سواری، مکان، باغ، گھوڑوں اور نوکروں کے لحاظ سے امتیاز تھا۔ خواص کی سواری کی شان و شوکت، لباس کی چمک دمک، عورتوں کے فیشن اور میک اپ، پر تکلف محلات، اکلاہ (ٹوپیاں) اور امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ ان کی اعلیٰ نسبی کا پتہ دیتے تھے۔ [ایران بعہد ساسانیاں ص ۲۰۷]

تعدد ازدواج کا عام رواج تھا۔ ایک شخص کے لیے بیویوں کی تعداد کی کوئی حد نہ تھی ہر شخص اپنی آمدنی کے مطابق بیویاں رکھ سکتا تھا، البتہ غریب آدمی کو صرف ایک بیوی پر قناعت کرنا پڑتی۔ جن لوگوں کی زیادہ بیویاں ہوتیں، ان میں ایک بڑی بیوی ہوتی جس کو زن پادشاہی کہتے۔ دوسری سب بیویاں اس کے ماتحت ہوتیں، اور ان کے حقوق بڑی بیوی سے مختلف ہوتے اور یہ سب "خدمت گار بیویاں" کہلاتیں ان کی طرف اولاد نرینہ کو خاندان میں داخلہ کا حق مل سکتا تھا۔ [ایران بعہد ساسانیاں ص ۳۴۲ ـ ۳۴۹]

خود خسرو پرویز کے بارہ میں علامہ طبری نے لکھا ہے کہ اس کی تین ہزار بیویاں تھیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں باندیاں تھیں جو بادشاہ کی ہر طرح کی خدمت کرتی تھیں، اور رقص و سرود کی محفلوں کو زینت بخشتیں۔ تین ہزار خدمت گار، آٹھ ہزار پانچ سو گھوڑے (ابن اثیر نے پچاس ہزار لکھے ہیں) سات سو ساٹھ ہاتھی، بارہ ہزار خچر اور جواہرات اور سونے چاندی کے برتنوں کا کوئی حساب نہیں تھا۔ [طبری ۲:۱۰۰۶، ابن اثیر ۱:۲۹۶]

کسریٰ کے تاج کے بارہ میں مختلف کتابوں میں درج ہے کہ اس کا وزن [illegible] تھا۔ یہ تاج طلائی تھا، یاقوت، زبرجد اور دوسرے قیمتی جواہرات سے آراستہ تھا۔ وزنی ہونے کی وجہ سے بادشاہ اسے سر پر اٹھا نہ سکتا تھا لہٰذا وہ تخت کے اوپر ایک طلائی زنجیر سے معلق تھا۔ کسریٰ تخت پر پردے میں جلوہ افروز ہو کر اس میں اپنا سر داخل کر دیتا۔ جونہی وہ پردہ ہٹا دیا جاتا تو حاضرین اس کی ہیبت اور دہشت سے سجدہ ریز ہو جاتے۔ [illegible]

امراء، روٴساء، جاگیرداروں اور مراعات یافتہ فوجی جرنیلوں کے لیے زرخرید غلاموں کی طرح دن رات کام کریں اور جو کچھ حاصل ہو وہ ان کے عیش و آرام کے لیے انہیں مہیا کریں۔ غریب عوام جو کچھ کماتے تھے وہ ٹیکسوں کی صورت میں ان سے چھین لیا جاتا تھا۔ ملک میں سات خاندان جن میں شاہی خاندان بھی شامل تھا، ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔ امراء جن کو "العظماء" کہا جاتا تھا، وہ بھی ہر قسم کے ٹیکس کی ادائیگی سے بری تھے۔ جو لوگ وسیع و عریض جاگیروں کے مالک تھے اور جن کے پاس دولت کے انبار تھے، انہیں ہر قسم کے ٹیکس کی مراعات حاصل تھیں، اور ٹیکسوں کا سارا بوجھ نادار اور مفلوک الحال عوام پر ڈال دیا گیا تھا اور وہ شام و پگاہ جانوروں کی طرح کام کر کے حکومت کے خزانہ کو بھرتے تاکہ یہ بڑے بڑے اعیان حکومت اس خزانہ عامرہ سے داد عیش دے سکیں۔

ان ٹیکسوں سے جمع شدہ رقم سے رفاہ عامہ پر بہت کم خرچ کیا جاتا۔ ملک کی آمدنی کا زیادہ تر حصہ بادشاہ کے ذاتی خزانہ میں جاتا جو اس کی ذاتی ملکیت ہوتا۔ مال غنیمت کا سارا روپیہ بادشاہ کا ذاتی شمار ہوتا۔ ملک کی جاگیروں کی ساری آمدنی بھی اس کے ذاتی خزانہ میں جاتی۔ عید نوروز اور مہرگان کے موقع پر جبراً قیمتی تحائف لیے جاتے جو سارے کے سارے بادشاہ کے ذاتی خزانہ میں جمع ہوتے۔ اس بے پناہ آمدنی سے بادشاہ تکلفات زندگی تعیشات اور سامان و آرائش کی وہ بہتات اپنے گرد جمع کرتا کہ عقل اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی۔ مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ The Age of Faith, P.145

دولت کے اس ارتکاز نے ملک کو اخلاقی طور پر دیوالیہ بنا دیا۔ جس معاشرہ میں بیٹی اور بہن اور دوسرے محرمات سے نکاح نہ صرف جائز بلکہ عین عبادت و ثواب سمجھا جاتا ہو اور اپنی بیوی دوسرے کو مستعار دینا ایک پسندیدہ فعل تصور کیا جاتا ہو۔ وہاں پھر دوسرے گناہوں کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ چنانچہ ایران کی اس سوسائٹی میں بھی زنا اور بدکاری کا عام رواج تھا۔ شراب کھلے بندوں پی جاتی تھی اور ہر قسم کی بے راہ روی اس معاشرہ میں رحمت آسمانی سمجھی جاتی تھی۔

مزدک کی تحریک نے جب مال و زر اور زن کے مشترک ہونے کا اعلان کیا تو اس

مظاہرہ کیا اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (The Age of Faith, P 144)

ابن اثیر نے اپنی تاریخ الکامل میں لکھا ہے کہ بادشاہ قباد جب مزدک کا پیروکار ہو گیا تو اس نے اپنی سلطنت کے تمام گورنروں کو بھی اس تحریک میں شمولیت کی دعوت دی۔ حیرہ کے گورنر منذر نے بادشاہ کی دعوت کو ٹھکرا دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کو گورنری سے معزول کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب قباد مر گیا تو اس کا بیٹا نوشیرواں تخت نشین ہوا۔ نوشیرواں اپنے باپ کے عقیدہ کے سخت مخالف تھا۔ نوشیرواں نے اپنے دربار میں لوگوں کو حاضری کا اذن عام دیا۔ اتفاق سے دو متضاد شخصیتیں بیک وقت اس کے دربار میں حاضر ہوئیں پہلے مزدک حاضر ہوا پھر معزول شدہ گورنر حیرہ منذر بن ماء السماء۔ نوشیرواں ان دونوں کو دیکھ کر اچھل پڑا اور کہا۔

"میری زندگی کی دو آرزوئیں تھیں مجھے امید ہے کہ یہ دونوں پوری ہو گئی ہیں۔"

مزدک نے پوچھا! شہنشاہ! وہ کون سی دو آرزوئیں تھیں؟

نوشیرواں نے جواب دیا:

"میری ایک آرزو یہ تھی کہ ایک باغیرت شخص المنذر کو اپنے عہدہ پر بحال کر دوں جس نے تیری دعوت کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور دوسری آرزو یہ تھی کہ ان زندیقوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں جنہوں نے ملک میں اخلاقی بے راہ روی پھیلا دی اور زن و زر کو سب کی مشترکہ چیز بنا دیا ہے۔"

مزدک کو پتہ تھا کہ ملک میں میرے ماننے والوں کی اکثریت ہے اور بادشاہ اس تحریک کو ختم نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس نے کہا: "کیا تیرے بس میں ہے کہ ان تمام انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دے جو اس تحریک کے رکن ہیں؟" یہ جواب سن کر نوشیرواں ایک دم غصے میں اچھل پڑا اور بے تاب ہو کر کہنے لگا:

"او زانیہ کے بچے! تو ابھی تک یہاں موجود ہے۔ بخدا تیری جرابوں کی بدبو ابھی تک میری ناک میں موجود ہے جب تم نے اپنی ماں

کی عصمت بچانے کے لئے تیر سے چھید ڈالا اور متعفن پاؤں کو بوسہ دیا تھا۔"

چنانچہ نوشیرواں نے اسی وقت حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر دیا جائے اور اس کی لاش کو سولی پر لٹکا دیا جائے تاکہ لوگ اس کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔ اس کے قتل کے بعد مزدکیوں نے ملک میں شورش برپا کرنے کی کوشش کی لیکن نوشیرواں کے حکم سے ایک دن میں ایک لاکھ مزدکیوں کو قتل کر دیا گیا۔

مزدک اور اس کے پیروکاروں نے لوگوں کی جو جائیدادیں اور مال و دولت چھینی تھیں، وہ اصلی مالکوں کو واپس کی گئیں۔ اس طرح سے یہ فتنہ نوشیرواں کی جرأت اور دلیری سے اپنے انجام کو پہنچا اور لوگوں نے آرام کا سانس لیا۔ اسی روز اس کو "نوشیرواں" کے لقب سے ملقب کیا گیا۔

یہ تھی مختصر سی داستان اس ملک کی جس کا بادشاہ اپنے کو "سب خداؤں سے بڑا خدا اور تمام روئے زمین کا مالک" کہتا تھا اور جس کے بادشاہ خسرو پرویز نے اپنے القابات کو یہاں تک بلند کیا کہ:

> "خداؤں میں انسان غیر فانی اور انسانوں میں خدائے لاثانی، جس کے نام کا بول بالا، آفتاب کے ساتھ طلوع کرنے والا ہے، شب کی آنکھوں کا اجالا" (ایران بعہد ساسانیاں ص ۳۵۹)

وہ بادشاہ اپنے کو من جانب خدا اور اپنی ذات کو جملہ اختیارات کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کو یہاں تک اختیار تھا کہ بادشاہ اس کی مال اور جان کے علاوہ یہ بھی اختیار تھا کہ جس شخص کے بارے میں چاہیں بغیر کسی جرم و خطا کے سولی پر لٹکا دیں۔ ان کے اس ظالمانہ فعل پر کسی شخص کو صدائے احتجاج بلند کرنے کی قطعاً کوئی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک باپ نے اپنے چار لڑکے میدانِ جنگ میں بھیجے۔ ان میں سے ایک بھائی نے بادشاہ سے درخواست کی کہ ان کے پانچویں بھائی کو یہ اجازت دے دی جائے کہ امورِ زراعت کی نگرانی کرے اور بوڑھے والدین کی خدمت کرے۔ لیکن "نازک مزاج شاہان تاب سخن

"اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو ان کی تباہی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال اور تباہی سے نہیں بچا سکتی تھی۔"

ایک اور مقام پر ایڈورڈ گبن نے اپنی کتاب "تاریخ زوال و انحطاط روما" میں لکھا ہے:

"رومن حکومت مخالفین کی نظر میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالم اور ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ کفایت شعاری جتنی ہوتی جا رہی تھی اس قدر اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکسوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔"

(The History of Decline and Fall of Roman Empire, Vol.I,P.124)

اس سیاسی ابتری اور اخلاقی انحطاط اور پستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کی وحشی اقوام نے سلطنت روما کے مغربی بازو کو کچل کر رکھ دیا اور اپنے سفاکانہ اور وحشیانہ مظالم کی وجہ سے رعایا کو پیس کر رکھ دیا۔

سلطنت روما کے مشرقی بازو کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ چونکہ اس بازو کی سرحدیں سلطنت ایران سے ملتی تھیں، اس لیے یہ ہمیشہ ایران کی حکومت سے الجھا رہا اور پے در پے جنگوں نے اس کو نچوڑ کر رکھ دیا۔ رومیوں اور ایرانیوں کی باہمی کشمکش اور جنگوں میں جو چیز سب سے زیادہ افسوسناک تھی، وہ ان دونوں کی قومی عصبیت اور مذہبی جنون تھا جو اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ انسانیت و شرافت کی کوئی قدر ان کی نگاہ میں احترام کی مستحق نہ رہی تھی اور مذہب و اخلاق کی پامالی کا خوفناک سے خوفناک منظر بھی ان کے دلوں کو پسیجنے کے لیے کافی نہ تھا۔ چنانچہ ایرانی بادشاہ خسرو پرویز نے جب فلسطین پر حملہ کیا تو اس نے عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو نذر آتش کر دیا اور انتہائی بے دردی سے عیسائی رعایا کو تہ تیغ کیا۔ اسی طرح رومی سلطنت کے حکمران ہرقل نے جب شمال کی طرف سے ایران پر حملہ کیا

تھیں اور بندش۔ سماجی مذہبی تنظیموں کے انجام سے محفوظ رکھی تھیں۔"

(Robert Briffault: The Making of Humanity, P.159)

رومی حکومت کا اپنی رعایا کے ساتھ کوئی اچھا برتاؤ نہ تھا۔ ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ رعایا کے وسائل ترقی پر پابندی اور بندش تھی۔ ہر شخص حکومت کے ظلم و ستم کے بھاری بوجھ کے نیچے کراہ رہا تھا۔ اس سلسلہ میں الفرڈ بٹلر کا بیان رومی حکومت کے رعایا کے ساتھ معاملات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتا ہے:

"مصر میں رومی حکومت کا صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ جس طرح ہو سکے رعایا سے مال لوٹ کر حکام کو فائدہ پہنچایا جائے۔ رعایا کی بہتری، خوش حالی اور ان کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کا خیال کبھی ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آتا تھا۔ رعایا کے اخلاق کی درستی اور تہذیب کی بہتری اور ان کی مالی حالت کو بہتر کرنے کی انہیں کوئی فکر نہ تھی۔ مصر میں ان کی حکومت ان پردیسیوں کی سی تھی جو صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کرتے ہیں اور محکوم قوم کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے تک کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔"

(Alfred Butler Arabs Conquest of Egypt and the last Thirty years of the Roman Dominion,P.42)

مختلف کتب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ رومی حکومت کا برتاؤ اپنی رعایا کے ساتھ بہت ہی ناروا تھا۔ ان کے شہری اور انسانی حقوق غصب تھے۔ اکثر سرکاری ٹیکس ادا کرنے کے لیے وہ اپنی اولاد تک کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ غلام بنانے اور بیگار لینے کا ان میں عام رواج تھا۔ اسی بیگار سے رومی حکومت نے وہ ادارے اور عمارتیں تعمیر کیے جو رومیوں کا کارنامہ سمجھے جاتے ہیں۔ مختصر لفظوں میں یہ کہ رومی رعایا کے لیے ان کی حکومت بدترین مصیبت اور سخت ترین عذاب تھی۔

سے وہ اپنے ہی ملک میں کئی سال تک بھٹکتا رہا۔ آخر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک چکی والے کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس وقت اس کی جیب میں تین درہم بھی نہ تھے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ شخصیت و کردار)

مؤرخین نے کسریٰ کے اس فرش بہار جس پر بیٹھ کر امرائے ایران موسم خزاں میں شراب پیتے تھے، کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ ساٹھ گز مربع تھا، قریباً ایک ایکڑ زمین کو گھیر لیتا تھا۔ اس کی زمین سونے کی تھی جس میں جابجا جواہرات اور موتیوں کی گل کاری تھی جس میں پھول دار اور پھل دار درخت لگے ہوئے تھے۔ درختوں کی لکڑی سونے کی، پتے حریر کے، کلیاں سونے چاندی کی اور پھل جواہرات کے بنائے گئے تھے۔ گرد ہیرے کی جدول تھی۔ درمیان میں روشیں اور نہریں بنائی گئی تھیں، اور یہ سب جواہرات کی تھیں۔ موسم خزاں میں تاجداران آل ساسان اس گلشن بے خزاں میں بیٹھ کر شراب پیا کرتے تھے، اور دولت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آتا جو زمانے نے کبھی اور کہیں نہ دیکھا تھا۔"

(The Age of Faith pk 149 ، تاریخ اسلام، ص ۲۵۴ عبدالحلیم شرر)

طبری نے نقل کیا ہے کہ ایرانی سردوں پر جو کلاہ رکھتے تھے وہ کئی کئی لاکھ کی ہوتی تھی انہوں نے اپنے خیال میں اپنا معیار زندگی اتنا زیادہ اونچا کر لیا تھا کہ ایک شخص اپنی ذات اور اپنے لباس کے کسی ایک حصہ پر اتنا روپیہ صرف کرتا جس سے پوری بستی پرورش پاسکتی تھی۔ چنانچہ ہرمزی ایک کلاہ کی قیمت ایک لاکھ تھی جس میں مختلف قسم کے جواہرات جڑے ہوئے تھے شاہ حیرا کسریٰ کا ایک عزیز تھا اس کی کلاہ کی قیمت پچاس ہزار اور رستم جو کہ کسریٰ کا وزیر و فاتح تھا اس کی کلاہ کی قیمت بھی ایک لاکھ تھی۔

اصل میں بات یہ ہے کہ ان دونوں حکومتوں میں بہیمانہ طبقاتی نزاع، خود غرضانہ گروہ بندی، ملت کش مفاد پرستی، ظالمانہ سیاست، معاشی عدم مساوات اور جبر و استبداد اپنے

پورے عروج پر تھا اور ہر طرف وحشت اور بہیمیت کا دور دورہ تھا۔

مشرق خراب، مغرب ازاں بیشتر خراب
عالم تمام مردہ و بے ذوقِ جستجو

یہ دونوں حکومتیں اگر چہ اپنے آپ کو متمدن اور مہذب کہتی تھیں لیکن یہ تمدن اور تہذیب جنگل کے درندوں کی تھی نہ کہ شہروں اور بستیوں میں بسنے والے انسانوں کی۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس دور کو "جاہلیت" کا دور کہا ہے اور جس دور میں انسان نہ تو اپنے رب کو پہچانے اور نہ ہی دوسرے انسانوں کو اور نہ ہی اپنے آپ کو تو وہ یقیناً جاہلیت کا دور ہے۔

تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ رومی سلطنت کے معاشی حالات بھی ایران سے مختلف نہ تھے۔ یہاں بھی سلطنت کی آبادی دو طبقوں میں منقسم تھی۔ ایک امراء اور جاگیرداروں کا طبقہ اور دوسرے عوام اور غرباء کا طبقہ اور ان دونوں طبقات میں کش مکش (Tension) تھی امراء اور روساء اقتصادی طور پر عام طبقہ سے بلند و بالا اور زرعی زمینوں کے وسیع و عریض قطعات کے مالک تھے لہٰذا ان کے افراد کی اکثریت عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتی تھی۔ ان کو عیش و عشرت کے تمام اسباب مہیا کرنے کے لیے غرباء کو غلاموں اور نوکروں کی طرح دن رات کھیتوں اور باغات میں کام کرنا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے وہ کئی نسلوں سے غربت اور ناداری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وسائل رزق پر امراء کے طبقہ کا قبضہ تھا، اس وجہ سے وہ دن بدن غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا۔

اگر چہ ایران کے مقابلے میں یہاں علم کی کچھ روشنی تھی، کچھ درس گاہیں اور سکول بھی تھے، بعض لوگ کئی فن میں ماہر بھی تھے، جیسے ایک خاتون ہپاشیا (Hypatia) فن ریاضی میں ماہر تھی۔ علم فلکیات میں بطلیموس (Potolemy) نے اقلیدس اور چند [illegible] کے خطوط پر اپنا ایک مستقل نظریہ قائم کیا۔ اس کے علاوہ یونانی اور عیسائی پادریوں کے معاشرہ پر اچھے خاصے اثرات تھے لیکن ایک سرمایہ دارانہ نظام معاشرت میں لوگوں کو سونے چاندی کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ علم و فن کی اس معاشرہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ امراء اور خوش حال طبقہ کو زندگی کی ہر قسم کی سہولیات میسر تھیں جب کہ کاشتکار دست

ٹیکس وصول کرنے کی ذمہ داری مجلس نمائندگان کے ارکان پر عائد تھی۔ ساتویں صدی تک یہی دستور رہا کہ مجلس نمائندگان کے ارکان ٹیکسوں کی وصولی کرتے اور پھر اس کو حکومت کے خزانہ میں جمع کراتے۔ جو لوگ لگان ٹیکس نہیں دیتے تھے ان کے حصے کا لگان اور ٹیکس ان نمائندوں کو اپنی جیب سے ادا کرنا پڑتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس نمائندگان کے کئی ارکان بری طرح زیر بار ہو جاتے۔ کاشت کاروں پر اور بھی طرح طرح کی ذمہ داریاں ڈالی گئی تھیں جن میں سب سے زیادہ اہم ذمہ داری یہ تھی کہ حکومت کے ڈاک خانوں کے لیے گھوڑے، گاڑیاں اور لڑکے مہیا کرتا تھا۔ نیز چوتھی، پانچویں اور چھٹی صدی میں کاشت کاروں کو زمین کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی زمیندار زمین فروخت کر دیتا تو خریدنے والے کو زمین کے ساتھ وہ کاشت کار بھی منتقل کر دیے جاتے جو پہلے مالک کے وقت زمین میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ (گویا زمین کے ساتھ مزارعین بھی فروخت ہو جاتے) (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۱۹۷۲ء، ۴۴۰)

ایک اور جگہ یہ مقالہ نگار لکھتا ہے:

"اگر کبھی ناگوار موسموں کے باعث فصلیں تباہ و برباد ہو جاتیں تو اس کے باوجود لگان اور زرعی ٹیکسوں میں کمی نہیں کی جاتی تھی، اور جو شخص مالی تنگی کی وجہ سے لگان اور زرعی ٹیکس ادا نہیں کرتا تھا تو اس کی غیر منقولہ جائیداد بحق سرکار ضبط کر لی جاتی تھی۔ ان مالی مجبوریوں اور مالی مظالم کے باعث کبھی کبھی لوگ بغاوت کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک بغاوت ۵۳۲ء میں ہوئی اس میں صرف دارالسلطنت میں تیس (۳۰) ہزار افراد کام آئے۔"

(انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۱۱/۳۴۲)

تو اس کا جوڑ کاٹ دیا جائے اس طرح کہ وہ مرے نہیں۔ شودر کسی
برہمن کے بال یا پاؤں یا داڑھی پکڑے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا
جائے۔ شودر کو کوئی صلاح مشورہ نہ دو۔ دھرم اور برت کی تلقین بھی نہ
کرو۔ جو شودر کو دھرم کی تلقین کرتا ہے، وہ بدترین دوزخ میں
جاتا ہے۔" (سمرتی ص ۱۲۸، ۱۲۹)

بعض کتابوں میں ہے کہ شودر مندروں میں جا کر پوجا پاٹ نہیں کر سکتے تھے۔ نہ ان کے کنوؤں سے پانی پی سکتے تھے بلکہ ان کی آبادیاں شہروں سے الگ تھلگ ہوتی تھیں۔ گویا سوسائٹی کا عضو معطل سمجھ کر شودروں کو کاٹ کر الگ کر دیا گیا تھا۔

ان حالات میں ہندو معاشرہ کی اخلاقی حالت بھی نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ بڑے بڑے مندروں میں دیوداسیوں کے طائفے ہوتے تھے جو دیوتاؤں کی مورتیوں کے سامنے رقص کیا کرتیں اور گیت گایا کرتیں۔ مندر کے پروہت کو اس بات کا پورا اختیار تھا کہ وہ کسی پجاری کو شاد کام اور اس کا دل خوش کرنے کے لیے کسی دیوداسی کو اس کے پاس رات گزارنے کے لئے بھیج دے۔ مولانا صاحب نے سوامی دیانند کے حوالے سے ہندو سماج کی اخلاقی حالت کے بارہ میں لکھا ہے۔

"اب ان خود غرض مذہبی پیشواؤں نے ایسے باطل مذہبوں کی تلقین
شروع کی جس سے کوئی بداخلاقی گناہ نہ رہی۔ زناکاری کی بصراحت
عام اجازت دے دی گئی بلکہ ایک خاص موقع "بھیرویں چکر" پر
شراب خوری اور زناکاری مذہباً فرض قرار دی گئی اور اس موقع پر مرد
اور عورت سب ایک جگہ جمع ہوتے۔ مرد ایک ایک عورت کو مادرزاد
برہنہ کر کے پوجا کرتے اور عورتیں مرد کو ننگا کر کے پوجتیں اس موقع
پر شراب پی جاتی اور بدمست ہو کر کوئی کسی عورت کو، کوئی اپنی یا کسی
دوسرے کی لڑکی کو، کوئی کسی لڑکی یا اپنی ماں بہن یا بہو وغیرہ کو جو
وہاں موجود ہوتی پکڑ لیتا اور جس کے ساتھ چاہتا بدفعلی کر سکتا تھا۔

اس مذہبی تقریب کے علاوہ عام طور پر زناکاری کے لیے
ایک نیا مختصر راستہ نکالا گیا تھا جس کی رو سے مرد و عورت "سالہا" باہم
بسر کرتے تھے اور کسی پابندی یا کسی رشتے کے لحاظ کی ضرورت
باقی نہ رہتی تھی۔" (مسیحیت ص ۱۰)

یہ سب خرابیاں جن کے بارے میں سطور بالا میں بتایا گیا ہے جزیرہ نما عرب کے اندر کی خرابیاں تھیں یہ سب سیاسی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی طور پر انحطاط اور تنزل کے انتہائی نقطے پر پہنچی ہوئی تھیں۔ مگر جہاں تک ایران اور روم کی سلطنتیں سپر پاورز کہلاتی تھیں لیکن ان دونوں طاقتوں کی اخلاقی بنیادیں بالکل کھوکھلی ہو چکی تھیں اور وہ زیادہ دیر تک کھڑی نہیں رہ سکتی تھیں۔ ان دونوں سلطنتوں کے علاوہ اور جتنی سلطنتیں تھیں ان کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ چنانچہ ایک مغربی سیرت نگار مسٹر بوڈلے (R. V. C Bodley) نے اپنی مشہور کتاب "پیغمبر" (The Messenger) میں جناب رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت کی دنیا کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے اس وقت کے تمام ملکوں اور اقوام کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"قدیم روایات کے باوجود چھٹی صدی عیسوی کی اس دنیا میں عربوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ حقیقت میں تو کسی کو بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ ایک تنزل کا دور تھا۔ جب کہ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا کی عظیم سلطنتیں پیچھے کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ یہ اپنے شاہی دور کے اختتام پر تھیں۔ یہ ایک ایسی دنیا تھی جو اب بھی یونان کی فصاحت، ایران کی عظمت اور روما کی شوکت و جلال سے متحیر تھی اور کوئی ایسا ایک نظریہ یا کوئی ایسا ایک مذہب بھی نہ تھا جو ان میں سے کسی کو تھام لیتا۔"

"یہودی تمام دنیا میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ان کو کوئی مرکزی رہنمائی حاصل نہ تھی۔ عادت کے مطابق یہ تو ان کو

حکمران رہا۔"

"اسپین اور انگلستان غیراہم چھوٹے ملک تھے۔
اسپین ویزی گوتھوں (Visigoths) کے زیر اثر تھا جو کچھ عرصہ پہلے
ہی فرانس سے جس پر انہوں نے لوائر (Loire) تک قبضہ کر رکھا
تھا، نکالے گئے تھے، وہ ان یہودیوں پر مظالم ڈھا رہے تھے جن کو
اس مسلم حملہ کے لیے جو ابھی سو برس بعد ہونے والا تھا، آسانیاں پیدا
کر لی تھیں۔

"جزائر برطانیہ آزاد ریاستوں میں منقسم تھا۔ ڈیڑھ سو
سال رومیوں کو رواتہ ہوئے ہو چکے تھے جن کی جگہ نارڈک لوگوں کی
آمد نے لے لی تھی۔ خود انگلستان سات مختلف بادشاہتوں پر مشتمل
تھا۔" (باختصار ترجمہ سید قاسم محمود)

یہ تو اردگرد کی حکومتوں کا ذکر تھا، لیکن خود جزیرہ نما عرب بھی اس سے مختلف نہ تھا
کیوں کہ اس میں تو کچھ اور زیادہ خرابیاں تھیں۔ اگرچہ بہت سی خصوصیات بھی تھیں لیکن ان
خرابیوں نے ان کی خوبیوں اور خصوصیتوں کو ڈھانپ رکھا تھا اور بیرونی دنیا کو وہ خوبیاں
بہت کم نظر آ رہی تھیں۔

جزیرہ نما عرب

خود جزیرہ نما عرب جہاں نبی اکرم ﷺ پیدا ہوئے۔ ہر قسم کی جاہلیت سے اٹا
پڑا تھا۔ اگرچہ اس قوم میں ذہانت و فراست، شجاعت و بسالت، جود و سخاوت، حمیت
وغیرت، فصاحت و بلاغت اور ایفائے عہد جیسی خصوصیات تھیں، لیکن اس قسم کی گوناگوں
خوبیوں کے باوجود ان کی زندگی کے کئی تاریک پہلو بھی تھے۔ سب سے بڑا تاریک پہلو تو
یہی تھا کہ نورِ نبوت سے ان کا رشتہ یک قلم منقطع ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے ان کی یہ ساری
خوبیاں، خصلتیں، مقاصد و محرکات رذیل کاموں کے لیے وقف ہو کر رہ گئیں۔ حق کے راستے سے

یعنی جب ایک کتا دوسرے کتے کے سامنے نہیں جھکتا تو انسان کس قدر عقل و دانش سے کورا اور عقل و خرد سے خالی ہے جو نہ صرف ایک انسان کے سامنے بلکہ ایک انسان کے تراشے ہوئے بت کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے۔ مکہ اور بیت اللہ کی بنیاد خود اللہ کے خلیل حنیف سیدنا ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ہاتھوں رکھی۔ اس کی تعمیر کا مقصد محض اللہ تعالیٰ کی عبادت تھا لیکن جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کی روشنی مدھم ہوئی اور جہالت اور نفس پرستی نے اپنے پنجے گاڑ دیے تو احکام الٰہی کے بجائے وہ اپنی نفسانی خواہشات کے بندے بن گئے اور اصنام پرستی اور باطل عقائد کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ عمرو بن لحی نے بت پرستی کو رواج دیا۔ چنانچہ صاحب السیر نے لکھا ہے کہ

"علمائے کرام کی اس بارے میں بکثرت تصریحات ہیں کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر عمرو بن لحی کے زمانے تک اہل عرب آپ کے عقائد پر ہی ثابت قدم رہے۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے دین ابراہیمی کو تبدیل کیا (فهو اول من غير دين ابراهيم) اور اہل عرب کے لیے کئی قسم کی گمراہیاں شروع کیں اور بتوں کی عبادت کا سلسلہ شروع کیا۔" (السیرۃ، ۱۰۱)

یہی کچھ علامہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔ (ابن خلدون)

بتوں کے بارے میں عربوں کا عقیدہ

ان بتوں کے بارے میں عربوں کا کیا عقیدہ تھا؟ قرآن حکیم نے اس کو یوں فرمایا ہے۔ عرب ان بتوں کو وسیلہ مانتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ہماری سفارش کرتے ہیں، ہماری گواہی دیتے ہیں۔ وہ بتوں کی قسمیں بھی کھاتے تھے اور ان کے سامنے حلف بھی اٹھاتے تھے اور ان کی عبادت بھی کرتے تھے۔ ان کے سامنے سجدہ ریز بھی ہوتے تھے۔ ان کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے۔ اور اگر کوئی جانور بڑھاپے کو پہنچ جاتا تو وہ اس کو بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ چنانچہ بت کے نام پر چھوڑے ہوئے اونٹ کو "حام" اور اونٹنی کو "سائبہ" کہتے تھے۔

"اے جھوٹے خدا! تجھ کو اللہ تعالیٰ کبھی برکت نہ دے کہ تو نے میرے اونٹوں کو بھگا دیا اور انہیں تتر بتر کر دیا۔"

پھر اس نے بڑی مشکل سے اپنے اونٹوں کو اکٹھا کیا۔ جب وہ وہاں سے روانہ ہوا تو وہ دو شعر پڑھ رہا تھا جن کا ترجمہ یہ ہے:

(۱) "ہم سعد بت کے پاس آئے تاکہ وہ ہمارے پراگندہ شیرازہ کو منظم کر دے لیکن ہوا یہ کہ سعد (بت) نے ہماری جمعیت کو تتر بتر کر دیا۔ اب سعد سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔"

(۲) "سعد کیا ہے؟ لق و دق صحرا میں ایک چٹان ہے۔ نہ وہ گمراہی کی دعوت دے سکتا ہے اور نہ ہی وہ حق پر کسی کو رکھ سکتا ہے اور نہ کوئی نفع نقصان ہمیں پہنچا سکتا ہے۔" (بلوغ الارب ۲/۲۰۵)

اسی طرح کا ایک اور واقعہ پروفیسر حتی (Hitti) نے کتاب الاغانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ امرؤ القیس اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے روانہ ہوا تو ذوالخلصہ کے مندر میں ٹھہرا تاکہ تیروں سے فال نکلوائے کہ وہ اس انتقام لینے میں کامیاب ہوگا بھی یا نہیں؟ تین دفعہ فال نکالی تینوں دفعہ یہی نکلا کہ ارادہ چھوڑ دو۔ اس نے ٹوٹے ہوئے تیر دیوتا کے منہ پر دے مارے اور زور سے چلایا: "ملعون! اگر تیرا اپنا باپ مارا گیا ہوتا تو پھر مجھے انتقام لینے سے ہرگز منع نہ کرتا۔" (الاغانی ۸/۷۰)

کلبی نے لکھا ہے کہ قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ جنوں کی پوجا کرتی تھی۔

(کتاب الاصنام ص ۳۴)

قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا تھا۔ کنانہ چاند کا پرستار تھا۔ بنو تمیم دبران کی، لخم اور جذام مشتری کی، قبیلہ طے سہیل کی، بنو قیس شعریٰ کی اور بنو اسد عطارد کی پرستش کرتا تھا۔

(ملاحظہ ہو طبقات الامم ص ۴۳۰)

دین ابراہیمی میں تبدیلی

اہل عرب نے بت پرستی کی وجہ سے دین ابراہیمی میں تبدیلی کر دی ہوئی تھی جن

اپنا مال سمجھتے تھے اور اس کو مال میں سے کچھ حصہ نہ دیتے تھے۔ شوہر کے مرنے یا طلاق دینے
کے بعد اس کو اجازت نہیں تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کر سکے۔

مختصر یہ کہ صنف نازک مردوں کے ظلم و ستم کا شکار بنی ہوئی تھی۔ مرد عورتیں نہیں بلکہ
صنف نازک کے لیے جنگل کا درندہ تھا۔ عورت کا مقصد صرف نسل انسانی کی ترقی اور مردوں کی
خدمت کرنا رہ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکیوں کی پیدائش باعث ننگ و عار تھی۔ پیدا ہونے کے
ساتھ ہی ان کو زندہ درگور کر دینا لوگوں نے اپنا وطیرہ و افتخار و شرافت سمجھ رکھا تھا۔ چنانچہ قرآن
حکیم میں مختلف سورتوں میں اس کو بیان کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو النحل، ۵۸، زخرف ۱۷، تکویر ۸ وغیرہ)

ہیثم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا دستور عرب کے تمام
قبائل میں پایا جاتا تھا، ایک اس پر عمل کرتا دس چھوڑتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک
جاری رہا جب تک کہ اسلام نہیں آیا۔

اس سلسلہ میں سنن دارمی میں ایک روایت ہے کہ ایک شخص نے خدمت نبوی
میں آکر عرض کی "یا رسول اللہ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے۔ بتوں کو پوجتے تھے اور اپنی
اولاد کو مار دیتے تھے۔ میری ایک لڑکی تھی، جب میں اس کو بلاتا تو وہ دوڑ کر میرے سامنے
آتی۔ ایک روز وہ میرے بلانے پر خوشی خوشی دوڑی آئی۔ میں آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے
پیچھے چلی آئی۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ جب ایک کنویں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے
کچھ دور نہ تھا اور لڑکی اس کے قریب پہنچی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کنویں میں
پھینک دیا۔ وہ ابا ابا کہہ کر پکارتی رہی اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔" سرکار دو عالم
ﷺ اس کے اس پر درد افسانہ کو سن کر اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔

لڑکیوں وغیرہ کا یہ قتل بعض لوگ ننگ و عار کی بنا پر کرتے اور بعض مفلسی اور
ناداری کے ڈر سے اولاد کو مار دیتے۔ عرب کے بعض شرفاء اور رؤساء ایسے موقع پر بچیوں کو
خرید لیتے اور ان کی جان بچاتے۔ چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ نے اس میں بڑا
نام پیدا کیا۔ اسلام لانے کے بعد وہ سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے
لگے "یا رسول اللہ! میں نے ۳۰۰ لڑکیوں کو موت کے منہ سے بچایا ہے، کیا مجھ کو اس کا

ثواب ہوگا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں! آپ کو ضرور ثواب ملے گا کیوں کہ خدا نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے۔" (ابن سعد بحوالہ نقوش رسول نمبر)

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے چچا زید بن عمرو بن نفیل نے بھی ایسی کئی لڑکیوں کی پرورش کی تھی۔ (بخاری ۱/۵۴۰)

یہ ایک نامکمل سی تصویر ہے اس جاہلیت کی جو سرکارِ دوعالم ﷺ کی بعثت سے قبل تمام دنیا میں اور بالخصوص عرب میں تھی۔ اسی وجہ سے اس عہد کو "جاہلیت" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جاہلیت عمدہ کھانوں، عالی شان عمارات اور بنگلوں، فرنشڈ کمروں، زرق برق لباس کے نہ ہونے کا نام نہیں۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی جاہلیت ہو سکتی ہے۔ اگر انسانوں میں انسانی اقدار کا فقدان ہو، انسانیت اخلاق کی بلندی اور نجابت و شرافت کا نام ہے۔ سر بفلک محلات، عمدہ اور فرنشڈ بنگلوں، لمبی لمبی کاروں اور مرغن غذاؤں کا نام نہیں۔ سرکارِ دوعالم ﷺ نے اپنی ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی میں ۸۱ جنگیں لڑیں جن میں ۲۷ میں آپ خود شریک ہوئے۔ ان تمام غزوات میں (یعنی ۸۱ غزوات میں) کل ۱۰۱۸ آدمی ہلاک ہوئے جن میں ۲۵۹ مسلمان اور باقی ۷۵۹ غیر مسلم تھے، لیکن دورِ حاضر کی دو جنگوں میں جو لوگ مارے گئے ان کی تعداد چار کروڑ کے قریب ہے۔

اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سرکارِ دوعالم ﷺ نے ۲۳ سال کے مختصر عرصے میں دنیا میں ایک غیر خونی انقلاب برپا کر دیا۔ (اس اعتبار سے آپ "پیغمبرِ انقلاب" ہیں۔) جب کہ موجودہ جاہلیت (جس کو جاہلیت جدیدہ بھی کہا جا سکتا ہے) کے دور میں چار کروڑ انسانوں کو قتل کر کے بھی دنیا میں کوئی انقلاب نہ آیا بلکہ ایک بے مقصد جنگ ہوتی رہی جو کہ جاہلیت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ اسی طرح موجودہ دور میں عراق اور افغانستان میں امریکہ اور اس کے اتحادی جمہوریت کے نام پر جو قتل عام کر رہے ہیں وہ بھی ایک جاہلیت ہے کیوں کہ جب جمہور کو موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تو جمہوریت کہاں قائم ہوگی؟

طلوع آفتاب نبوت

جب پوری دنیا گناہوں کی غلاظت اور عصیان و نافرمانی کی گندگی میں اس قدر غلطاں تھی جس کا مختصر تذکرہ گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے تو رحمت خداوندی کو جوش آیا اور سرزمین مکہ میں ایک دعائے خلیل اور نوید مسیحا سیدنا و مولانا محمد ﷺ مبعوث ہوئے۔ مکہ پہاڑوں کے درمیان ایک پتھریلی زمین پر واقع ہے۔ نہایت چھوٹا سا شہر، زمین پتھریلی، راستے مسدود، وسائل حیات نہایت محدود۔ قرآن حکیم میں مکہ کا نام بکہ آیا ہے (۹۶:۳) ابن ہشام نے سیرۃ میں لکھا ہے کہ "اس کا نام بکہ اس لیے ہوا کہ یہ جابر اور ظالم حکمرانوں کی گردنیں توڑ دیتا ہے۔ جب وہ اس سرزمین پر ظلم کرتے ہیں۔" (سیرت ابن ہشام ۱/۱۲۷)

انبیاء علیہم السلام بڑے عالی نسب ہوتے ہیں۔ خود سرکار دو عالم ﷺ بھی تمام قریش میں اعلیٰ نسب کے مالک تھے۔ چنانچہ ابوسفیان نے بھی حالت کفر میں قیصر روم کے دربار میں یہ اقرار کیا تھا کہ "ھو فینا ذو نسب" وہ ہم میں بڑے نسب والا ہے۔

حافظ ابن حجر نے "فتح الباری" میں روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے

﴿ھو فی حسب ما لا یفضل علیہ احد قال: ھذہ آیۃ﴾

(فتح الباری: ۱۲۲/۸)

"حسب و نسب میں ان سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ قیصر نے کہا کہ یہ بھی ایک نشانی ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔"

آپ ﷺ کب پیدا ہوئے؟ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کو آسمانوں پر گئے ہوئے قریباً چھ سو سال گزر چکے تھے اور وہ آنے والے پیغمبر کے لیے ایک نہیں کئی مواقع پر پیش گوئیاں کر چکے تھے۔ لیکن سنہ کے لحاظ سے مورخین لکھتے ہیں کہ ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کو آپ عرب کی سرزمین مکہ میں پیدا ہوئے۔ رات کی سیاہی چھٹ رہی تھی اور صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا کہ خانہ کعبہ کے متولی اور مکہ کے سردار خواجہ عبدالمطلب کی

من حاسد مضطرب العيان

''یعنی کہ میں اسے توانا اور مضبوط رکھوں، میں اس کو ہر دشمن اور ہر حاسد اور آنکھوں کے گھمانے والے کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دیتا ہوں۔'' [ذہبی ۱/۳۳ و سبل الہدیٰ [illegible] طبقات ابن سعد ۱/۱۰۳]

بعض روایات میں ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ جب پیدا ہوئے تو آپ مختون تھے اور آپ کی ناف کٹی ہوئی تھی۔ آپ کے دادا خواجہ عبدالمطلب کو جب ان باتوں کا پتہ چلا تو آپ کو بڑا تعجب ہوا اور بات بھی تعجب ہونے والی تھی کیونکہ اس سے قبل کبھی ایسا دیکھا اور سنا نہ تھا، اس وجہ سے آپ نے فرمایا:

﴿لیکونن لابنی شان﴾

''میرے اس بیٹے کی بہت بڑی شان ہوگی۔''

بعض روایات میں ہے کہ آپ مختون پیدا ہوئے تھے لیکن بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ ساتویں روز خواجہ عبدالمطلب نے تمام قریش کو دعوت دی اور اپنے اس پوتے کا ختنہ اور عقیقہ کیا۔ دعوت میں شمولیت کرنے والوں نے پوچھا کہ آپ نے اس نومولود کا کیا نام رکھا تو خواجہ عبدالمطلب نے فرمایا ''میں نے اپنے اس پوتے کا نام ''محمد'' رکھا ہے۔ پوچھا گیا کہ یہ نام رکھنے کی کیا وجہ ہے تو آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ نام اس لیے رکھا ہے کہ آسمانوں میں اللہ تعالیٰ اور زمین میں اس کی مخلوق اس نومولود کی تعریف کرے چنانچہ لغت عرب میں ''محمد'' کا مطلب ہے ''کل جامع بصفات الخیر یسمّٰی محمدا'' یعنی جو شخص خیر کی تمام صفات کا جامع ہو اسے محمد کہا جاتا ہے۔

''محمد'' باب تفعیل میں سے ہے، اس باب میں تکرار پایا جاتا ہے۔ اس خاصہ کے مطابق اسم ''محمد'' کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ذات جس کی بار بار خوب تعریف اور حمد و ثنا کی جاتی ہو۔ [خاتم النبیین [illegible] ۱/۱۵۱]

امام سہیلیؒ نے بھی یہی لکھا ہے کہ لغت عرب میں ''محمد'' اس ہستی کو کہتے ہیں جس کی بار بار تعریف کی جائے کیونکہ اس باب میں فعل کا تکرار پایا جاتا ہے۔ [روض الانف ۱/۱۰۴]

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کی والدہ کو بتایا گیا کہ تم بچے کا نام احمد رکھنا چنانچہ آپ ﷺ کا نام احمد رکھا گیا۔ بعض روایتوں میں دونوں نام مذکور ہیں۔

احمد اسمِ تفضیل کا صیغہ ہے اس کا معنی ہے "حمد کرنے والے سے زیادہ اپنے رب کی حمد کرنے والا۔"

سرورِ کائنات ﷺ کے پورے خاندان میں کسی نے یہ نام نہیں رکھا تھا۔ اسی وجہ سے قوم قریش نے بڑے تعجب سے یہ نام رکھنے کی وجہ دریافت کی تو خواجہ عبدالمطلب نے کہا کہ میں نے یہ نام اس لیے رکھا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ آسمان پر اور اس کی مخلوق زمین پر اس کی تعریف کرے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۵۵۵، البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۶۴)

قاضی عیاض نے ایک روایت اس بارے میں یہ نقل فرمائی ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ عالمِ وجود میں آنے اور "محمد" ہونے سے قبل "احمد" تھے کیونکہ آپ کا یہ اسمِ گرامی سابقہ کتب میں مذکور تھا۔ چنانچہ سیدنا مسیح نے اسی نام سے آپ کو یاد کیا ہے۔

(الشفاء ۱:۲۳۰)

ساری مخلوقات کے لحاظ سے آپ سب سے پہلے نبی ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں امام ترمذی نے سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے دریافت کیا:

"یا رسول اللہ! آپ کو نبوت کب ملی؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "اس وقت جب کہ آدم علیہ السلام ابھی جسم اور روح کے درمیان تھے۔"

اس مضمون کی اور بہت سی احادیث مختلف کتابوں میں مرقوم ہیں۔ ایک روایت میں ہے:

﴿کنت اول النبیین فی الخلق و آخرھم فی البعث﴾

(کنز العمال ج ۱۱ ص ۴۰۹، حدیث نمبر ۳۲۱۲۶، الشفاء ج ۱ ص ۴۶۵)

"میں خلقت کے لحاظ سے سب سے پہلا نبی ہوں اور بعثت کے لحاظ سے سب سے آخری۔"

اس سلسلہ میں امام سیوطی نے خصائص ۲:۱۹۷ اور حافظ ذہبی نے تاریخ اسلام
۱:۲۴ وغیرہ میں بھی روایات نقل کی ہیں

ان تمام روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ

(۱) آپ عالمِ ارواح میں منصبِ نبوت سے حقیقتاً سرفراز تھے۔

(۲) اسی طرح صفتِ وجود میں بھی آپ کی ذاتِ اقدس سب سے مقدم تھی۔

(۳) اسی طرح صفتِ نبوت میں بھی آپ کا سب سے مقدم ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اس بارے میں ہمارے معاصر حضرت مولانا سید محمد صاحب مدنی فرماتے ہیں کہ

"قدرت کی طرف سے کسی کمال کے عطا کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔
کبھی وہ عالمِ وجود میں آنے کے بعد کمال کا اضافہ کرتی ہے اور کبھی
وجود سے پہلے عالمِ ارواح ہی میں اس کمال سے نوازدیتی ہے جس کا
ظہور تاریخ انسانی میں بعد میں ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس
کمال کا علم متعلقہ ذات یا کسی کو بذریعہ وحی ہوتا ہے۔ ہاں مخلوق کو
پہلی صورت کا علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کمال ان کے
مشاہدہ میں آجائے اور دوسرے کمال کے علم کی اس کے سوا کوئی
صورت نہیں کہ کوئی مخبر صادق اس کی خبر دے۔ یہاں آنحضرت
ﷺ کے ارشاد سے ہمیں اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ کمال نبوت
آپ کو اس وقت حاصل ہو چکا تھا جب کہ آدم ابھی اپنی صورت
پر استوار بھی نہ ہونے پائے تھے اور اسی وقت نبی وعدہ سے آپ
کے لیے ایمان و نصرت کا عہد بھی لے لیا گیا تھا کہ معلوم ہو جائے
کہ آپ کی رسالت ان سب کو بھی شامل ہے۔ اس لحاظ سے سب
سے پہلے نبی آپ ہوئے مگر جسم عنصری کے لحاظ سے آپ کا ظہور
سب سے آخر میں ہوا۔ اس لیے آپ آخر الانبیاء بھی کہلائے مگر اس
معنی میں نہیں کہ آپ کو نبوت سب سے آخر میں ملی ہے بلکہ اس معنی

کے لیے امام کی تلاش ہو رہی تھی، چنانچہ جبرئیل امین نے آپ کو ہاتھ سے پکڑ کر امامت کے مصلی پر کھڑا کر دیا، اور اس طرح آپ ہی کی ذات گرامی امامت کی مستحق ٹھہری۔ دوسرا اجتماع قیامت کے روز ہوگا۔ وہاں بھی تمام انبیاء کرام ﷤ آپ ہی کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے جب کہ ہر امت اپنے اپنے نبی کے جھنڈے کے نیچے ہوگی۔

تیسری بار شفاعت کا مرحلہ ہوگا یہاں بھی سب کا خطیب اور امام آپ ہی کی ذات گرامی ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہئے کہ جو منصب نبوت آپ کو اس امت کے لیے حاصل ہے وہی منصب آپ کو بلحاظ انبیاء بھی حاصل ہے۔ اگر اس دنیا میں بھی کہیں انبیاء ﷤ کا آپ کے ساتھ اجتماع ہو جاتا تو یہاں بھی یہی حقیقت عیاں ہو جاتی۔ چنانچہ سیدنا عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام جب اس عالم میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو ان کا تعلق آپ کی شریعت کے ساتھ وہی ہوگا جو آپ کی تمام امت کا ہے۔

یہ میثاق حدیث کی روایات کے مطابق سیدنا آدم ﷤ سے لے کر سیدنا عیسیٰ ﷤ تک تمام انبیاء ﷤ سے عالم ارواح سے لیا گیا تھا کہ ہر نبی سرکار دو عالم ﷺ پر ایمان لائے گا اور آپ کی رسالت کی تصدیق کرے گا، اور تمام مہمات میں آپ ﷺ کی نصرت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لینے کے بعد اس کی تاکید کے لیے ان سے صراحتاً اقرار کروا لیا اور پھر اس کی مزید تاکید کے لیے فرمایا کہ "تم اس پر گواہ رہنا اور میں بھی گواہوں میں سے ہوں۔" پھر اس کے بعد فرمایا کہ "پھر اس کے بعد جو عہد سے پھرا وہی لوگ نافرمان ہیں۔" بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ کلام انبیاء کرام ﷤ کی امتوں کی طرف متوجہ ہے کیوں کہ حق تعالیٰ شانہ سے عہد کرنے کے بعد اس عہد سے پھرنا انبیاء کرام ﷤ سے ممکن نہیں ہوسکتا، لیکن علامہ سید محمود آلوسی قدس سرہ نے لکھا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ یہ کلام انبیاء ﷤ کی طرف متوجہ ہو یعنی بفرض محال اگر نبیوں میں سے بھی کوئی اس عہد سے پھرا اور اس نے اس میثاق سے روگردانی کی تو وہ بھی فاسق ہو جائے گا اور اس میں ان کی امتوں سے تعریضاً خطاب ہے یعنی صراحتاً انبیاء ﷤ کی طرف اسناد ہے اور کنایۃً ان کی امتوں کی طرف۔ (روح المعانی: ۲۱۲/۳)

یہاں بعض حضرات ایک شبہ بیان کرتے ہیں کہ اس آیت میں ان انبیاء علیہم السلام سے میثاق لینے کا ذکر ہے جن پر کتاب نازل کی گئی ہے، اور وہ صرف ۱۴ ہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام انبیاء علیہم السلام سے میثاق لیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن نبیوں پر کتاب نازل نہیں کی گئی وہ بھی ان نبیوں کے حکم میں ہیں جن پر کتاب نازل کی گئی ہے کیونکہ ان کو نبوت اور حکمت دونوں عطا کی گئی ہیں۔ نیز جن انبیاء علیہم السلام کو کتاب نہیں دی گئی ان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ سابق نبی کی کتاب پر عمل کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آیت میں کتاب و حکمت سے مراد دین ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہی ہے البتہ شریعت ہر ایک کی مختلف ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے اپنی کتاب میں روایت نقل کی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"تمام انبیاء علاتی بھائی ہیں۔ (علاتی بھائی وہ ہوتے ہیں جن کا باپ ایک ہو اور والدہ مختلف ہو) ان کی مائیں (شرائع) مختلف ہیں اور ان کا دین واحد ہے۔" (بخاری شریف ۱/۴۹۰)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام، رسول اللہ ﷺ کی تقدیراً امت ہیں اور تمام آپ کی تحقیقاً امت ہیں۔ اگر کوئی نبی آپ کی حیات میں مبعوث ہوتا تو آپ پر ایمان لاتا اور آپ کی نصرت کرنا اس پر ضروری ہوتا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ:

"بے شک موسیٰ اگر تمہارے سامنے زندہ ہوتے تو میری پیروی کرنے کے سوا ان کے لیے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔" (مسند احمد ۳/۳۳۸)

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہی نبی مطلق، رسول حقیقی اور مستقل شارع ہیں اور آپ کے علاوہ دوسرے تمام انبیاء آپ ﷺ کے تابع ہیں۔ (روح المعانی ۳/۲۰۶)

آپ ربوبیت خداوندی کے شاہد اول ہیں۔ روز الست میں جب اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو انہی کی جانوں پر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا

رب نہیں ہوں؟ انہوں نے جواب دیا "بے شک آپ ہمارے رب ہیں ہم گواہی دیتے ہیں۔" یہ اس لیے کیا کہ کہیں قیامت کے روز عذر کرنے لگو کہ ہم تو اس کی خبر نہ تھی۔" (الاعراف ۱۷۲)

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام مخلوق کو یہ سوال ہوا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو ساری مخلوق خاموش تھی اور سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا "بلیٰ" کیوں نہیں تو ہمارا رب ہے۔" آپ ﷺ کے جواب کے بعد پھر دوسری مخلوق نے جن میں انبیاء علیہم بھی شامل تھے، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے اثبات کیا۔

حافظ سید محمود آلوسی نے لکھا ہے کہ

"بعض اہل اللہ نے لکھا ہے کہ جب سیدنا آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد کے ذروں کو نکالا گیا تو سب سے پہلے سرکار دو عالم ﷺ کے ذرے نے جواب دیا تھا، اور جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین سے یہ فرمایا تھا: "خوشی یا ناخوشی سے دونوں حاضر ہو جاؤ تو دونوں نے کہا ہم خوشی سے حاضر ہوئے۔" (حم السجدہ ۱۱) اس وقت زمین کے جس ذرہ نے سب سے پہلے جواب دیا تھا وہ نبی کریم ﷺ کا ذرہ تھا۔ اور یہ کعبہ کی مٹی کا ذرہ تھا۔ اور سب سے پہلے زمین کا یہی حصہ بنایا گیا تھا، پھر اسی کو پھیلایا گیا جب کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آپ کی تربت (مٹی) کعبہ کی مٹی تھی تو آپ کا دفن بھی کعبہ میں ہونا چاہیے تھا کیونکہ روایت ہے کہ جس جگہ کی مٹی سے انسان بنایا جاتا ہے اسی جگہ اس کا دفن ہوتا ہے لیکن کہا گیا ہے کہ جب طوفان آیا تو ایک جگہ کی مٹی دوسری جگہ پہنچ گئی تھی، اور مٹی کا وہ ایک ذرہ جو سرکار دو عالم ﷺ کا مبدا تھا اس جگہ پہنچ گیا جہاں اب مدینہ طیبہ میں سرکار دو عالم ﷺ کا مدفن ہے، اور اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی تخلیق اصل ہے اور تمام کائنات آپ ﷺ کی تابع ہے۔ ایک قول یہ ہے

تو وہ قابل برداشت بھی ہو جاتی ہے اور اس کی ماہیت بھی بدل جاتی ہے۔

بلا کسی تشبیہ کے صرف بات سمجھانے کے لیے حق تعالیٰ شانہ کا علم اتنا بلند و بالا ہوتا ہے کہ مخلوق اس کو برداشت نہیں کر سکتی لیکن جب اسی علم خداوندی کو قلب نبوت میں سے گزارا جاتا ہے تو اس میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے بجائے گرمی کے اس میں برودت پیدا ہو جاتی ہے اور نا قابل فہم ہونے کے بجائے وہ عام مخلوق کے بھی قابل فہم ہو جاتا ہے۔

چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ جب اس دنیا میں تشریف لائے اور آپ ﷺ نے اعلان نبوت فرمایا اور علم الٰہی قلب نبوت میں سے گزرا تو آپ کو دیکھو تو آفتاب کی طرح روشن کتاب ملی اور ماہتاب کی طرح خلق عظیم ملا۔ گویا آپ ﷺ کے ایک ہاتھ میں آفتاب تھا اور دوسرے میں ماہتاب۔ معلوم ہوا کہ بنیاد نبوت دو چیزیں ہیں۔ ایک علم اور دوسرا اخلاق۔ یہ دو چیزیں آپ اس دنیا میں لے کر آئے۔ ان کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک تو آپ کا علمی کمال تھا اور دوسرا عملی کمال۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم نے کمال علم اور کمال عمل کے لحاظ سے چار درجے بیان کیے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ (النساء: ۶۹)

”اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے جو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں اور یہ کیا ہی عمدہ ساتھی ہیں۔“

یہ چاروں علم اور عمل کے لحاظ سے دو دو قسمیں ہیں۔ نبی اور صدیق یہ دو تو علم کی دو قسمیں ہیں اور شہید اور صالح یہ عمل کی بلندی کی دو قسمیں ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ علم وحی نبی کے قلب پر آتا ہے کیونکہ نبی علم کے لحاظ سے اصل ہوتا ہے اور اس کی تصدیق کرنے والے کو صدیق کہتے ہیں۔ تو صدیق اور تصدیق یہ بھی علم ہی کی ایک قسم ہے کیوں کہ تصدیق علم ہی کی قسم ہے۔ البتہ یہ ہے کہ نبی علم میں اصل ہوتا اور صدیق تابع۔ اس لیے یہ دو افراد علم کے

ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

"صدیق اپنے قلب کو سراً، ظاہراً اور باطناً اپنے آپ کو ہر پہلو سے رسول کے سپرد کر چکا ہوتا ہے۔ علم، عقیدہ، حال، آداب و اخلاق، محبت اور تعلقات، اپنی پسند اور ناپسند غرضیکہ ہر بات میں وہ رسول کے تابع ہوتا ہے۔ اس کو نہ تحدیث کی ضرورت ہوتی ہے کہ باہر سے کچھ ملے اور نہ کشف والہام کا انتظار کہ اندر سے کچھ نکلے۔"

(مدارج السالکین، ۱/۶۴)

اس سلسلہ میں حضرت مجدد صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے:

"صدیقیت کے اوپر سوائے نبوت کے اور کوئی مقام نہیں ہے اور صدیقیت اور نبوت کے درمیان کوئی اور مقام ہونا بھی نہیں چاہیے، بلکہ یہ محال ہے کہ کوئی اور مقام ہو اور محالیت کا یہ علم کشف صریح صحیح سے معلوم ہوا ہے۔" (مکتوبات جلد مکتوب ۸۱)

گویا کہ رسول اور نبی کو وحی کے ذریعہ جن حقائق کا علم ہوتا ہے اور وہ دوسروں تک پہنچاتا ہے، ایک صدیق اس کی بے چون و چرا تصدیق کرتا ہے۔ نبی کی بیان کی ہوئی حقیقت کیسی ہی بالائے فہم اور مابعد الطبیعی ہو صدیق کے لیے وہ بدیہی ہوتی ہے، اور جوں ہی صدیق کے کان میں نبی کی آواز پہنچتی ہے وہ بے چون و چرا اسے قبول کر لیتا ہے۔

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں:

"یہ بات اس لیے ہے کہ انوار وحی نبی کی ذات سے صدیق کی ذات پر پے در پے پڑتے ہیں اور پھر جس قدر تاثیر (اثر ڈالنے) اور تاثر (اثر قبول کرنے) کا تکرار ہوتا رہتا ہے، صدیق میں نبی کی ذات میں فنا ہونے اور اس پر فدا ہونے کے جذبات ابھرتے ہیں ..... اور صدیق کی یہ علامت ہے کہ اسے خواب کی تعبیر کا علم سب سے زیادہ ہوتا ہے اور اس کی جبلت اور فطرت ہوتی ہے کہ معمولی سے سبب

چوبیس ہزار کے قریب انبیاء علیہم السلام تشریف لائے ان میں سے ہر نبی کا ایک مخصوص علم تھا۔ بعض کو مخصوص علوم دیئے گئے جیسے سیدنا آدم علیہ السلام کو اسماء وصفات کا علم دیا گیا، سیدنا یوسف علیہ السلام کو تعبیر خواب کا علم عطا فرمایا گیا، سیدنا سلیمان علیہ السلام کو منطق الطیر یعنی پرندوں کی بولیاں سمجھنے کا علم دیا گیا، سیدنا خضر علیہ السلام کو علم لدنی عطا فرمایا گیا۔ تو سارے انبیاء علیہم السلام ایسے ہیں جیسے کان، آنکھ، ناک اور زبان وغیرہ یعنی مختلف علوم کے حامل اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ام الدماغ کی ہے کہ سارے حواس کا علم اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کے علوم "خزانہ محمدی" جس کی حیثیت ام الدماغ کی ہے، جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اصل منبع خیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور آپ کے فیضان سے انبیاء میں نبوتوں کے علوم آئے یعنی جب آپ ہوئے تو سب انبیاء کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب سے علوم عطا فرمائے گئے۔ گویا

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اسی وجہ سے تمام انبیاء علیہم السلام کو آپ پر ایمان لانے کے لیے کہا گیا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں فرمایا:

﴿وانا نبی الانبیاء﴾ (خصائص کبریٰ للسیوطی ۱/۹۲)

"اور انبیاء تو اپنی اپنی امتوں کے نبی تھے اور میں نبیوں کا نبی ہوں۔"

چنانچہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں سے یہ عہد لیا کہ تم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ گے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ (آل عمران ۸۱)

یعنی "اور جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب اور حکمت دوں، پھر (وہ عظیم الشان) رسول جو تم سب کی تصدیق کرے اور ان سب علوم کی تصدیق کرے جو میں نے تمہیں دیئے

لاتے ہیں۔ ہمارا ایمان نبی کے ایمان کا عکس ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کے فیض سے تمام مومنوں پر ایمان کا عکس پڑ گیا تو ہم تم بھی مومن نظر آنے لگے۔ ہمارا ایمان بالاستقلال نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کے ایمان کے تابع ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے آفتاب نکلے اور مختلف دھوپوں کے ٹکڑے آپ دنیا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ان ٹکڑوں کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہیں۔ اگر دھوپ سے پوچھا جائے کہ تو کون ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ آفتاب کا ایک عکس ہوں۔ میرا اصلی وجود کچھ نہیں۔ وجود اصلی تو آفتاب کا ہے۔ اسی کی وجہ سے میرا وجود بھی نظر آتا ہے۔ میں خود آفتاب سے الگ ہو کر کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح مومن کے ایمان کا وجود اصل میں نبی کے ایمانی وجود کے تابع ہے۔ تو جب انبیاء علیہم السلام مومن ہوئے گئے اور انہیں ہدایت کی گئی کہ سرکار دو عالم ﷺ پر ایمان لاؤ تو اس کی صورت یہی ہے کہ حقیقی ایمان صرف سرکار دو عالم ﷺ کا ہے اور آپ ﷺ کے فیضان سے پھر انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی ایمان عطا کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم و ایمان کا "منبع خیر" سرکار دو عالم ﷺ کی ذات بابرکات ہے۔

سرکار دو عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ "اوتیت علم الاولین و الآخرین" یعنی اگلوں اور پچھلوں کے سارے علوم مجھے دیے گئے ہیں" وہ میرے سینے میں جمع ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اصل علوم تو آپ کے سینے میں ہیں اور وہ علوم پھر آپ کے فیضان سے دوسروں تک پہنچائے گئے۔ گویا کہ آپ حس مشترک اور منبع ہیں اور انبیاء کرام علیہم السلام مثل آنکھ ناک کان اور زبان کے ہیں۔ علم کا فیض سب ہی سے تقسیم ہوتا ہے۔ کسی کو کم ملا اور کسی کو کوئی۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

﴿وعلم آدم الاسماء کلها کما علمت الاسماء کلها﴾

"آدم علیہ السلام کو اسماء و صفات کا علم دیا گیا جیسا کہ سارے اسماء و صفات کا مجھے علم عطا کیا گیا ہے۔"

مختصر یہ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو جو علوم دیے گئے وہ حد کمال کے ساتھ تھے۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی ذات کے اندر جمع کر دیے گئے ہیں خواہ اسماء و صفات کا علم ہو۔

ذات پیدا فرمائی کہ اس کے انوار و برکات سے پچھلوں کو نبوتیں بخشی گئیں اور بعد میں آنے والوں کو ولایتیں بخشی گئیں۔ پہلے نبی بنتے تھے اور بعد والے ولی بنتے چلے گئے۔ معلوم ہوا نبوت بھی آپ ہی سے چلی اور ولایت بھی آپ ہی سے ہوگی۔ پچھلوں کی نبوتیں آپ کی نبوت سے مستفیض ہیں اور اگلے آنے والے اولیاء، ولی، مجتہد، محدث، فقیہ اور صوفی آپ کے کمالات نبوت سے بنتے گئے۔

پھر اور نبی تو صرف اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوئے اور ایک وقت کے لیے مبعوث ہوئے لیکن آفتاب نبوت قیامت تک کے لیے مبعوث ہوا اور نہ صرف ایک قوم کے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لیے، دنیا کی ہر قوم کے لیے، کالے اور گورے کے لیے، عجمی اور عربی کے لیے غرضیکہ قیامت تک آنے والی ساری انسانیت کے لیے خواہ وہ پہاڑوں میں رہتے ہوں یا جنگلوں میں، شہروں میں رہتے ہوں یا دیہات میں سب کے لیے بھیجا گیا۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾

سبا ۲۸

"اور ہم نے آپ کو (قیامت تک کے) تمام لوگوں کے لیے ثواب کی بشارت دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔"

آیت میں لفظ "کافۃ" استعمال کیا گیا ہے۔ "کف" انسان کی ہتھیلی کو کہتے ہیں جس کو انسان پھیلاتا ہے اور سمیٹتا ہے۔ اس آیت میں کافۃ کے معنی ہے لوگوں کو گناہوں سے روکنے والا۔ اس میں تا مبالغہ کی ہے۔ (خازن ج ۳ ص ۲۵۹)

اور علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

"کافۃ کا معنی ہے عامۃ یعنی ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے یا یہ کہ "الکافۃ" کا معنی ہے "الجامع" یعنی ہم نے آپ کو دنیا و آخرت میں تمام لوگوں کو جمع کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ پہلا قول ہی صحیح ہے کہ اس کا معنی ہے عام

آپ کی بعثت میں بھی عمومیت ہے۔ آپ صرف قیامت تک کے انسانوں اور جنات کی طرف ہی نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے بلکہ آپ فرشتوں، نباتات، جمادات اور چرندوں، پرندوں وغیرہ کی طرف بھی اللہ کے رسول بنا کر بھیجے گئے۔ گویا کہ آپ مکمل خیر ہیں اور جس جس شخص یا چیز کی نسبت آپ کی طرف ہوگی اس میں خیر کی شان اکملیت نمایاں ہوگی۔ اسی وجہ سے آپ کے عہد کو "خیر القرون" کہا گیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا:

﴿بعثت من خير قرون بني آدم قرنا فقرنا حتى كنت من القرن الذي كنت فيه﴾

"مجھے بنی آدم کے بہترین زمانہ میں مبعوث فرمایا گیا۔ زمانے پر زمانے گزرتے رہے یہاں تک کہ مجھے اس زمانہ میں رکھا گیا جس میں میں موجود ہوں۔" (بخاری رقم ۳۲۹۳، مسند احمد بن حنبل رقم ۸۷۷۵، مسند ابی یعلی رقم ۶۵۵۳، بیہقی فی شعب الایمان رقم ۱۴۰۳)

ایک اور روایت میں فرمایا کہ:

﴿خير الناس قرني، ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم﴾

"سب سے بہتر لوگ میرے زمانے کے ہیں پھر وہ جو ان سے قریب ہیں اور پھر وہ جو ان سے قریب ہیں۔"

معلوم ہوا کہ آپ کا زمانہ سب سے بہتر ہے۔ اس زمانے کے لوگ سب سے بہتر، وہ فرشتہ جو آپ پر وحی لے کر آتے وہ "خیر الملائکة" یعنی سب فرشتوں سے بہتر، وہ کتاب جو آپ پر نازل ہوئی وہ "خیر الکتب"، وہ دین جو آپ پر اترا وہ "خیر الادیان"، اور وہ شریعت جس کو آپ نے دنیا میں پھیلایا اور مؤمنوں کو اس پر عمل کرنے کے لیے کہا وہ "خیر الشرائع"۔ گویا کہ ہر وہ چیز جس کی آپ کی طرف نسبت ہوگی اس میں ساری خیریت آ گئی چنانچہ آپ کی امت بھی "خیر امت" ہے۔

لہٰذا شان میں اکملیت، بعثت میں عمومیت اور نسبت میں خیریت کے تین پہلو

آپ میں پائے جاتے تھے۔ علم میں بھی آپ کا سینہ تمام علوم کا گنجینہ بلکہ مخزن علوم الٰہی تھا۔ آپ ﷺ کا علم سب سے بڑھ کر تھا اور سب پر حاوی بھی اور تمام علوم کے آپ جامع بھی ہیں۔ اسی لیے آپ کو انبیائے سابقین کے لیے مصدق کہا گیا کہ آپ کی ذات والا صفات ان کی نبوت اور ان کے علوم کی تصدیق کرنے والی ہے، اور تصدیق وہی کیا کرتا ہے جو پہلے سے علوم جانتا ہو۔ جو ان علوم سے واقف و آشنا نہیں ہوگا وہ کبھی بھی ان کی تصدیق نہیں کرے گا۔ آپ کو "مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُم" کہا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبرو! جو علوم تم کو دیے گئے ہیں ان کی تصدیق کرنے والے سرکار دو عالم ﷺ ہوں گے۔ تو تصدیق کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سارے علوم آپ کے اندر تھے۔

آپ کے جامع العلوم ہونے کے باعث آپ کو معجزہ بھی علمی دیا گیا۔ آپ سے پہلے جتنے بھی نبی اس دنیا میں تشریف لائے ان سب کو عملی معجزات دیے گئے، اور عمل عامل کے جانے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تاریخ میں کہیں بھی آپ کو نہ تو عصائے موسوی ملے گا اور نہ ہی ید بیضا اور نہ ہی دم عیسوی سے شفا پانے والے اور زندہ ہونے والے مریض اور مردے، کیوں کہ سیدنا موسیٰ اور سیدنا عیسیٰ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کے معجزات بھی ناپید ہو گئے۔

رسول اللہ ﷺ کو اگرچہ ہزاروں عملی معجزات عطا کیے گئے لیکن ایک علمی معجزہ بھی آپ کو عطا فرمایا گیا۔ علم اللہ کی صفت ہے جو دائمی صفت ہے۔ آپ چونکہ تعلیم دینے کے لیے تشریف لائے تھے تو سب سے بڑی نبوت آپ کی اور سب سے بڑی تعلیم بھی آپ کی۔ اسی لیے آپ کو معجزہ علمی بھی دیا گیا۔ اور علم کی یہ خصوصیت ہے کہ معلم عالم کے جانے سے ختم نہیں ہوتا۔ آپ تشریف لے گئے لیکن علم نبوت آج تک موجود ہے اس لیے نبوت ابھی موجود ہے۔ اسی لیے آپ کے بعد کسی دوسرے کی نبوت کی حاجت نہیں، چونکہ دوسروں کی منقطع نبوت کے تحت آ گیا۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی دیگر نبوت کا معجزہ نہیں رہا تو نبوت بھی موجود نہیں لیکن نبوت محمد ﷺ آج بھی موجود ہے کیوں کہ اس کی اصل نبوت قرآن کریم موجود ہے اور یہ قیامت تک رہے گی، لہٰذا آپ ﷺ کی نبوت بھی قیامت تک کے لیے ہے۔ پھر

نے "خلق حسن" سے تعبیر فرمایا۔ یعنی اگر اس نے آپ کو ایک تھپڑ مارا اور آپ نے اس کے جواب میں اس کو بھی تھپڑ مار دیا تو عدل ہے لیکن اگر دو لگا دیے تو یہ تعدی اور ظلم ہوگا۔ تو "خلق حسن" کا مطلب ہے تعدی اور زیادتی سے بچ جانا اور عدل کے اوپر قائم رہنا۔ تو یہ خلق حسن کا مطلب ہے اعتدال اور معاملات کا عدل۔

(۲) دوسرا درجہ اخلاق کا "خلق کریم" ہے۔ اس میں دوسرا پہلو بھی ہوتا ہے یعنی ایثار اور قربانی ہوتی ہے۔ یعنی اگر کوئی دوسرا زیادتی کرے تو بجائے بدلہ لینے کے اسے معاف کر دیا جائے۔ جیسے ایک شخص نے آپ کو تھپڑ مارا، آپ نے اسے کہا کہ مجھے تم سے بدلہ لینے کا حق تو ہے لیکن میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ یہ ایک قسم کا ایثار ہے۔ اس کو "خلق کریم" کہتے ہیں۔

(۳) اخلاق کا تیسرا درجہ "خلق عظیم" ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی شخص آپ کے ساتھ زیادتی کرے تو نہ صرف آپ اسے معاف کر دیں بلکہ الٹا اس کے ساتھ احسان بھی کریں۔ یہ خلق عظیم ہے۔ جیسے حدیث میں ہے:

﴿صل من قطعک، واعف عمن ظلمک، واحسن الی من اساء الیک﴾

"جو تمہارے ساتھ قطع تعلق کرے تم اس کے ساتھ تعلق جوڑنے کی کوشش کرو، جو تم پر ظلم کرے اس کو معاف کر دو اور جو تم سے برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کرو۔"

اور انبیاء کرام علیہم السلام "خلق حسن" اور "خلق کریم" کی تعلیم دیتے تھے لیکن آپ ﷺ چونکہ خود خلق عظیم کے حامل تھے لہٰذا آپ ﷺ نے اپنی امت کو بھی "خلق عظیم" کی تعلیم دی۔ وہ اس طرح کہ ایک طرف تو یہ فرمایا کہ تم پر بدلہ لینا جائز ہے اور یہ فرمایا کہ تم پر معاف کرنا واجب ہے بلکہ دونوں چیزوں کو جمع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ احسان بھی پیش کر دیا۔ فرمایا:

﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾

"اور برائی کا بدلہ برائی ہے، تمہیں حق ہے کہ جو تمہارے ساتھ برائی

پکایا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: "تم اصحاب سے کہو کہ وہ کھائیں کیونکہ میں بادشاہ نہیں ہوں بلکہ قریش کی ایک ایسی عورت کا بیٹا ہوں جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی۔"

(المعجم الاوسط رقم ۱۳۸۲، مجمع الزوائد ج ۹ ص ۲۰)

سیدنا عمر ؓ فرماتے ہیں کہ جب رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ابن سلول فوت ہو گیا تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے سرکارِ دو عالم ﷺ کو بلایا گیا۔ جب آپ اس کی نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے تو میں دوڑ کر آپ ﷺ کے پاس گیا اور عرض کی "یا رسول اللہ! کیا آپ ابن ابی کی نمازِ جنازہ پڑھانے جا رہے ہیں؟ حالانکہ اس نے فلاں روز یہ اور یہ کہا تھا۔" میں نے آپ کو اس کی وہ تمام باتیں جو اس نے آپ کو اور آپ کے دین کو بدنام کرنے کے لیے کی ہوئی تھیں یاد دلائیں۔ میں اور کہتا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے تبسم فرمایا اور کہا "عمر! پیچھے ہٹ جاؤ۔" جب میں نے بہت اصرار کیا تو آپ نے فرمایا: "مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ استغفار کروں یا نہ کروں۔ سو میں نے استغفار کرنے کو اختیار کر لیا۔ اور اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ اگر میں نے ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کیا تو اس کی مغفرت کر دی جائے گی تو میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتا۔" سیدنا عمر ؓ فرماتے ہیں کہ پھر سرکارِ دو عالم ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۸۲)

ہبار بن الاسود نے نبی اکرم ﷺ کی صاحبزادی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو پشت میں نیزہ مارا تھا۔ اس وقت وہ حاملہ تھیں۔ وہ گر گئیں اور ان کا حمل ضائع ہو گیا۔ جس وقت سرکارِ دو عالم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مدینہ منورہ میں بیٹھے ہوئے تھے اچانک ہبار بن الاسود آ گیا وہ بہت فصیح اللسان تھا۔ اس نے کہا: "اے محمد! جس نے آپ کو برا کہا اس کو برا کہا گیا۔ میں آپ کے پاس اسلام کا اقرار کرنے آیا ہوں۔" پھر اس نے کلمہ شہادت پڑھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا اسلام قبول کر لیا۔ اسی وقت رسول اللہ ﷺ کی کنیز سلمیٰ آ گئیں اور انہوں نے ہبار سے کہا: "اللہ تیری آنکھوں کو ٹھنڈا نہ کرے تو وہی ہے جس نے فلاں فلاں کام کیا تھا۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اسلام نے ان تمام کاموں کو مٹا دیا ہے۔" اور سرکارِ دو عالم ﷺ نے اس کو برا کہنے اور اس کے گزشتہ کام گنوانے سے منع فرما

اپنے قبضہ میں لے لیا تھا کہ اناج کا ایک دانہ بھی ان تک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ بنو ہاشم کے بچے بھوک سے تڑپتے اور بلبلاتے تھے لیکن ان ظالموں کے پتھر سے زیادہ سخت دل کسی طرح نہ پسیجتے تھے بلکہ یہ بچوں کا رونا سن کر قہقہے لگاتے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے ان کی ان سب باتوں سے درگزر فرما کر ان کے لیے اناج کی بندش ختم کر دی۔ (سیرت ابن ہشام ۱: ۳۹۳)

سرکار دو عالم ﷺ کا یہ جذبۂ ترحم اور شفقت رحمت میدان جنگ میں بھی رہتا تھا۔ حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھیوں نے میدان بدر میں پانی کا ایک حوض اپنی ضرورت کے لیے تیار کیا تھا۔ لڑائی شروع ہونے سے قبل قریش مکہ کی فوج کے آدمی اس حوض پر پانی پینے آئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے انہیں پانی لینے سے روکنا چاہا۔ جنگی حکمت عملی اور اسٹریٹجی کا تقاضا بھی تھا کہ انہیں پانی نہ لینے دیا جاتا اور دشمن پر ہر قسم کی خوراک کی بندش کر دی جاتی لیکن سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: ”انہیں پانی لینے اور پینے سے منع نہ کرو۔“ (بخاری رقم ۳۹۹۳، ۳۹۹۴ مع فتح الباری باختلاف الفاظ)

کیا دنیا ایسی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟

خلاصہ یہ کہ انبیاء کی بعثت کی دو غرضیں ہوتی ہیں۔ ایک علم پھیلانا اور دوسرا مکارم اخلاق کی تکمیل۔ چنانچہ فرمایا: ”انما بعثت معلما“ یعنی میں دنیا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور دوسرے دنیا کو با اخلاق بنانے کے لیے فرمایا کہ ”بعثت لاتمم مکارم الاخلاق“ یعنی میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں کہ سب کو با اخلاق بنا دوں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے علم اور اخلاق دونوں کو دنیا میں پھیلایا۔

کو اپنی اپنی زندگی کے لیے ایک عملی نمونہ کی ضرورت ہے۔ اسلام ان تمام انسانوں کو سنت
نبوی کی اتباع کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مختلف طبقات انسانی کے لیے
اپنے پیغمبر کی عملی سیرت میں مثالیں اور نمونے رکھتا ہے، جو ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک
اسوۂ ہدایت کا چراغ بن سکتا اور وہ اس سنت کے چراغ کی روشنی میں پیغمبر اسلام ﷺ کی
عملی زندگی راہ نمائی کرتی ہے۔ اسلام کے صرف اس تعریف سے یہ بات روز روشن کی طرح
ثابت ہوتی ہے کہ پیغمبر اسلام کی سیرت طیبہ میں جامعیت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ
انسانوں کے ہر طبقہ اور صنف کے لیے آپ کی پاکیزہ سیرت میں نصیحت پذیری اور عمل کے
لیے ایک سبق موجود ہے۔ ایک حاکم کے لیے محکوم کی زندگی اور ایک محکوم کے لیے حاکم کی
زندگی، ایک امیر کے لیے غریب کی زندگی اور ایک غریب کے لیے امیر اور دولت مند کی
زندگی ایک کامل اور مکمل مثال اور نمونہ بن سکتی۔ اس لیے اس بات کی سخت ضرورت ہے
کہ عالمگیر اور دائمی پیغمبر کی زندگی ان تمام مختلف مناظر کے رنگ برنگ پھولوں کا ایک
گلدستہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ کی جامعیت پر حضرت مولانا سید سلیمان ندوی قدس سرہ نے
بڑی نفیس بحث فرمائی ہے جس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ آپ کی پاکیزہ اور مقدس
زندگی ہر انسانی گروہ اور ہر انسانی حالت کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل
اخلاق کا نمونہ ہے۔ یہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے، دوسرا کوئی پیغمبر کی سیرت
اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ کیوں کہ لکھنے والے نے بالکل درست کہا ہے کہ

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ عالمگیر اور دائمی پیغمبر کی زندگی ان تمام
مختلف مناظر کے رنگ برنگ پھولوں کا گلدستہ ہو۔ مختصر یہ کہ ایک کی انسانی زندگی جو ہر
انسانی گروہ اور ہر انسانی حالت کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اور مکمل
اخلاق کا نمونہ ہو وہ صرف اور صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ ہے۔ جس کی ذات
کو قدرت نے ہر انسانی گروہ کے لیے نمونہ اور اسوہ بنایا ہے۔ اور لکھنے والے نے بالکل

تیاری ہو رہی ہے۔ ٹھیک اسی عہد میں جب لڑائیوں نے قیدی مسلمانوں کے گھر اس میں لونڈی اور غلام بن کر پہنچ رہے ہیں، فاطمہؓ بنت رسول ﷺ اپنے ہاتھوں کے چھالے اور سینے کے داغ باپ کو دکھاتی ہے جو چکی پیستے پیستے اور مشکیزہ بھرتے بھرتے ہاتھ اور سینہ پر پڑ گئے تھے۔ ٹھیک اسی وقت جب آدھا عرب اس کے زیرنگیں ہوتا ہے سیدنا عمرؓ حاضر دربار ہوتے ہیں ادھر ادھر نظر اٹھا کر کاشانۂ نبوت کے سامان کا جائزہ لیتے ہیں: ایک کھردری چارپائی یا چٹائی پر آرام فرما رہے ہیں، جسم مبارک پر بانوں کے نشان پڑ گئے ہیں، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہیں، ایک کھونٹی پر خشک مشکیزہ لٹک رہا ہے۔ سرور کائنات ﷺ کے گھر کی کل کائنات دیکھ کر سیدنا عمرؓ رو پڑتے ہیں۔ سبب دریافت ہوتا ہے۔ عرض کرتے ہیں: "یارسول اللہ! اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا؟ قیصر و کسریٰ باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپ پیغمبر ہوکر اس حالت میں ہیں۔" ارشاد ہوتا ہے: "عمر! کیا تو اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا کے مزے لوٹیں اور ہم آخرت کی سعادت کے۔" (خطبات مدراس ص ۹۰۔۹۱)

اس خطبہ میں ذرا آگے چل کر سید صاحب نے سرور دو عالم ﷺ کی حیات کی جامعیت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

"حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی کفر کے خلاف غیظ و غضب کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات بت شکنی کا منظر دکھاتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد، شاہانہ نظم و نسق اور اجتماعی دستور و قوانین کی مثال پیش کرتی ہے۔

تھا وہ سب مجموعی طور پر آنحضرت ﷺ کو عنایت ہوا۔

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حضرت موسیٰ قانون لے کر آئے۔ حضرت داؤد دعا اور مناجات لے کر اور حضرت عیسیٰ زہد و اخلاق لے کر، مگر محمد ﷺ قانون بھی لائے، دعا و مناجات بھی، اور زہد و اخلاق بھی، ان سب کا مجموعہ الفاظ و معانی میں قرآن اور عمل میں سیرت محمد ﷺ ہے۔"

[خطبات مدراس ص ۹۱۔۹۲]

تجارت اور زراعت کی آمدنی سے وہ بنو تمیم کے محتاجوں کی کفالت فرماتے اور ان کی بیواؤں اور یتیموں کی امداد فرماتے اور سیدہ عائشہؓ کو سالانہ دس ہزار درہم دیتے۔

(طبقات ابن سعد ۳/۱۵۷)

گھر میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔ تجارت اور زراعت دونوں طریقوں سے مال و دولت گھر میں آتی تھی لیکن جتنا مال آتا ان میں لاکھوں درہم و دینار اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے۔ ایک مرتبہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے صاحبزادے موسیٰ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تمہارے والد کس قدر دولت چھوڑ کر گئے؟ انہوں نے کہا: "بائیس لاکھ درہم، دو لاکھ دینار، اس کے علاوہ کثیر مقدار میں سونا اور چاندی۔ غیر منقولہ جائیداد اس کے علاوہ تھی جس کی کل قیمت کا محتاط اندازہ تین کروڑ درہم تھا۔" یہ سن کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: "عاش حميداً سخياً شريفاً وقتل فقيداً رحمه الله"

(طبقات ابن سعد ۳/۱۵۸، سیر اعلام النبلاء ۱/۳۲)

اسی طرح سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کا پیشہ بھی تجارت تھا۔ حالت یہ تھی کہ آپ جس کام کو ہاتھ لگاتے اس میں کبھی خسارہ نہ ہوتا۔ (الاستیعاب ۱/۲۰۸) فاروقی فوج میں افسر بھی کچھ عرصہ رہے۔ فاروقی افسروں کی تنخواہیں سات سے دس ہزار درہم تک تھیں۔ اتنا مال دار ہونے کے باوجود فیاضی اور سخاوت میں ایک بہت بڑے مقام کے حامل تھے۔ آپ کے پاس ایک ہزار غلام تھے جو روزانہ اجرت پر کام کر کے ایک بہت بڑی رقم لاتے تھے لیکن اس مال میں سے آپ نے ایک حبہ بھی اپنی ذات پر اور نہ اپنے اہل و عیال پر کبھی صرف نہ کیا تھا بلکہ جو کچھ آتا وہ اسی وقت اللہ کے راستے میں خرچ کر دیتے۔ ایک مرتبہ ایک مکان چھ لاکھ میں فروخت کیا۔ کسی نے کہا کہ آپ نے زیادہ قیمت لی ہے۔ فرمایا: "ہرگز نہیں۔" اور وہ ساری کی ساری رقم راہ خدا میں تقسیم فرما دی۔ (سیر اعلام النبلاء ۱/۴۲)

سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جب ہجرت فرمائی تو مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ نے سیدنا سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ کو ان کا اسلامی بھائی بنایا۔ سیدنا سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنا مال و دولت تقسیم کرنا چاہا اور کہا میں انصار میں سب

ہے پھر اتنی دولت ہونے کے باوجود بھی ان کے دلوں میں سیری کے جذبات نہیں پیدا ہوئے اور آج بھی اگر کوئی اعلان کر دے کہ میں نے اپنی زکوٰۃ تقسیم کرنی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ بڑے بڑے سرمایہ دار جو زکوٰۃ کے قطعاً مستحق نہیں ہیں وہ بھی زکوٰۃ لینے والوں کی قطار میں جا کر کھڑے ہو جائیں گے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دولت کی ہوس کا جذبہ اپنے پورے شباب پر ہے اور اتنی دولت ہونے کے باوجود بھی دلوں میں سیری پیدا نہیں ہوئی۔ حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کا ملفوظ ہے فرماتے ہیں کہ دولت کی ہوس سمندر کا پانی پینے کے مترادف ہے۔ سمندر کا پانی نمکین ہوتا ہے جتنا پیو اتنی ہی زیادہ پیاس لگتی ہے۔ پیاس ختم نہیں ہوتی۔ اسی طرح جن دلوں میں حب دنیا کا جذبہ اٹھکیلیاں لیتا ہے ان کے پاس جتنا بھی مال آ جائے وہ کم ہوتا ہے۔ ان کی سیری نہیں ہوتی۔ وجہ یہی ہے کہ دلوں کی دنیا سنوری نہیں۔ وہ اپنے مالوں میں صرف اپنا حق سمجھتے ہیں، غرباء اور مساکین کا حق نہیں سمجھتے اور قرآن کہتا ہے:

> ''جو لوگ رات کو بہت کم سوتے، اوقات سحر میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں، جن کے مالوں میں سائل کا بھی حق ہو اور اس کا بھی جو محروم ہے (مگر سوال نہیں کرتا)'' (ذاریات ۱۷-۱۹)

ایک اور مقام پر فرمایا:

> ''جو یتیم، مسکین اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں ایسی حالت میں کہ جب کھانا خود ان کو محبوب ہو۔ (وہ خود ضرورت مند ہوں نیت یہ ہو کہ) ہم صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ تم سے (بھوکوں اور ضرورت مندوں سے) نہ اس کا کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ'' (الدھر ۹)

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ بخل اور سخاوت فطرت انسانی کی دو خصلتیں اور دو وصف ہیں۔ ان کی کچھ خصوصیات اور کچھ لوازم و ثمرات ہیں۔ بخل کے لیے حرص، طمع، تنگ نظری، خود غرضی، بزدلی، بے رحمی اور سنگ دلی لازمی صفات ہیں، جن کے نتیجے میں

دولت کی گردش رک جاتی ہے۔ جو محروم رہ جاتا ہے وہ دن بدن اور زیادہ محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جو خوش حال ہوتا ہے وہ اور زیادہ خوش حال ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ چند لوگوں کے پاس تو بے حساب دولت اکٹھی ہو جاتی ہے اور اکثریت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی معمولی ضروریات بھی فراہم نہیں کر سکتی۔

دولت کے صحیح مصرف پر نظر یہ ہوتی ہے کہ آدمی اس دنیا کے بعد آنے والی زندگی پر یقین کرے اور اس احساس کے ساتھ زندگی گزارے کہ یہ دنیا اکٹھا کرنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ آخرت کے لیے خرچ کرنے کی جگہ ہے۔ اسلامی تاریخ اس قسم کی بے شمار مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن ملکوں میں اسلامی نظام قائم ہوا وہاں سے غریبی کا نام و نشان مٹ گیا یا کم از کم غریبی کا احساس ختم ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ کا تجارت کی طرف شغف

رسول اللہ ﷺ کے تجارتی شغف کو دیکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ کو تجارت کا شوق پیدا ہوا تھا۔ ویسے بھی مکہ کے لوگ اکثر تجارتی ذہن کے تھے کیونکہ مکہ ایک وادی غیر ذی زرع تھا۔ تمام زمین پتھریلی اور ناقابل زراعت تھی۔ اس وجہ سے آپ کے آباؤ اجداد بھی تجارت ہی کرتے رہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں تین پشت کے بعد ایک شخص نضر پیدا ہوا۔ زرقانی نے لکھا ہے کہ اس کا اصل نام قیس تھا۔ نضر اس لئے کہتے تھے کہ وہ بڑے حسین و جمیل تھے اور نضر "نضرۃ" سے مشتق ہے اس کے معنی رونق اور تروتازگی کے ہیں۔ زرقانی ج ۱ ص [illegible]۔

نضر کے والد کا نام کنانہ تھا۔ ان کے علم و فضل کی وجہ سے دور دراز سے لوگ ان کی زیارت کے لیے آیا کرتے تھے۔ انہی کنانہ کے بارہ میں ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے اولاد اسماعیل میں سے کنانہ کو اور کنانہ سے قریش کو اور قریش سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو برگزیدہ

حلوا پکوا کر اہل مکہ کو بڑے افراط سے کھلایا۔ اس وقت ان کا خطاب ہاشم پڑ گیا کیونکہ "ہشم" کا مطلب ہے چورہ کرنا، اور ہاشم اس سے اسم فاعل ہے یعنی روٹیوں کو چورہ کر کے کھلانے والا۔ تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ عبد مناف قریش میں، سارے عرب میں، بلکہ آس پاس کے ممالک عراق، یمن اور شام کے سلاطین کے دربار تک بھی بہت شریف، معزز اور بڑے بلند مرتبہ و باعزت لوگ سمجھے جاتے تھے۔ خصوصاً ہاشم بن عبد مناف کی شرافت ضرب المثل تھی۔ ان کا لقب اہل عرب نے "سید البطحاء" رکھا تھا یعنی مکہ اور بطحا کا سردار اور سید۔

ہاشم کے پاس سقایہ اور رفادہ سب سے اہم شعبے تھے لیکن ان کے لیے مال و دولت کی ضرورت تھی اور محنت و مشقت کی بھی۔ یہ اگرچہ عبد مناف کے چاروں بیٹوں کے سپرد ہوئے تھے لیکن ان میں پیش پیش ہاشم رہے کیونکہ یہ سب بھائیوں میں سب سے زیادہ بلند حوصلہ، صاحب ثروت اور با سلیقہ آدمی تھے۔

ہاشم کا ذریعہ آمدنی تجارت تھی۔ بازنطینی حکومت کے بادشاہ ہرقل سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ہرقل نے ہاشم کو لکھا کہ مجھ کو آپ کے جود و سخا کی اطلاع پہنچی ہے۔ میں اپنی شہزادی کو جو حسن و جمال میں یکتائے روزگار ہے آپ کے حبالہ عقد میں دینا چاہتا ہوں۔ آپ یہاں تشریف لائیں تا کہ میں آپ سے شہزادی کا نکاح کر دوں۔ لیکن ہاشم نے ہرقل کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ [illegible]

جناب ہاشم نے نہ صرف حاجیوں کے آرام و آسائش کا انتظام کیا بلکہ تاریخ کے صفحات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے قریش کی ترقی اور ان کی ہر قسم کی سہولتوں کی طرف بھی توجہ کی۔ چنانچہ انہوں نے شام، روم اور حبشہ کے بادشاہوں سے اپنی قوم کے تجارتی امن و امان کے حصول کے فرامین حاصل کیے۔ ہاشم ہی نے سب سے پہلے قریش میں یہ دستور رائج کیا کہ سال میں دو مرتبہ تجارت کے لیے قافلے روانہ ہوا کریں، موسم گرما میں شام کی طرف اور موسم سرما میں یمن کی طرف۔ چنانچہ اس دستور

تھے کہ راستہ میں یثرب (مدینہ منورہ) میں قیام ہوا۔ وہاں ایک میلہ میں ایک عورت کو دیکھا جو اپنی دکان پر بیٹھی نہایت سلیقہ اور ہوشیاری سے اسے چلا رہی تھی۔ شکل وصورت میں چودھویں کا چاند، جو دیکھے بس اسی کا ہو کر رہ جائے۔ ہاشم بھی اس کی سلیقہ مندی اور سمجھداری سے بہت متاثر ہوئے۔ کیونکہ شرافت وجاہت اور فہم وفراست اس کے چہرہ سے ٹپک رہی تھی۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ بنو نجار کی خاتون سلمٰی بنت عمرو بن زید ہے۔ شوہر کا نام احیحہ تھا لیکن اس سے تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔ دو لڑکے عمرو اور معبد ہیں جن کے سہارے اپنی زندگی گزار رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص نکاح کا پیغام بھیجتا ہے تو یہ شرط لگاتی ہے کہ طلاق کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہوگا، یعنی وہ جب چاہے گی جدا ہو جائے گی۔ ہاشم پہلے ہی اس کو دل دے بیٹھے تھے لہٰذا اپنے نکاح کا پیغام بھیج دیا۔ سلمٰی نے ہاشم بن عبد مناف کا نام پہلے ہی سن رکھا تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ مکہ کا بے تاج بادشاہ ہے اور سارے عرب میں اسکا طوطی بول رہا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ پیغام قبول کر لیا اور نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد ہاشم نے بڑی پرتکلف دعوت کی جس میں تمام قافلہ والوں کے علاوہ خزرج کے لوگ بھی مدعو ہوئے۔ کچھ عرصہ مدینہ میں قیام کر کے ہاشم شام چلے گئے اور سلمٰی امید سے ہو گئی۔ ہاشم کا اسی سفر میں انتقال ہو گیا اور وہ وہیں غزہ میں دفن ہوئے، لیکن ادھر سلمٰی کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ پیدا ہوتے وقت سر میں ایک سفید بال تھا اس وجہ سے "شیبۃ الحمد" نام رکھا گیا۔

[طبقات ابن سعد ۱/۴۶]

خواجہ عبدالمطلب

ہاشم نے اپنے بھائی کو یہ وصیت کی تھی کہ اس کی اولاد کی نگرانی کرے۔ مطلب نے اپنے بھائی کی وصیت کا پورا پورا خیال رکھا۔ اسی وجہ سے ہاشم اور مطلب کی اولاد میں بھی اتحاد رہا۔ مطلب بھی نہایت اعلیٰ قابلیت کے حامل تھے لہٰذا وہ ہاشم کی وفات کے بعد ان کی خدمات کو بخوبی انجام دیتے رہے مورخین نے ان کے بارہ میں لکھا ہے کہ:

"مطلب نہایت صاحب فضیلت وشرافت بزرگ تھے۔ قریش ان

کی سخاوت و سماحت کے باعث انھیں "شیبۃ الحمد" کا نام دیتے

ہیں۔[1] ابن خلدون ۱۸۰، سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۴۲

شیبۃ الحمد (عبدالمطلب) ابھی چند برس کے تھے کہ ہاشم کا غزہ کے مقام پر انتقال ہو گیا اور شیبہ یتیم ہو گئے۔ آپ اس وقت یثرب میں اپنے ننھیال میں تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے ماموں کے زیر کفالت پرورش پائی۔ انھوں نے نہایت شفقت و محبت سے یتیم بھانجے کی پرورش کی اور اسے ایک لمحہ بھی یتیمی کا احساس نہ ہونے دیا۔

بعض روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ بنو حارث بن عبد مناف کا ایک شخص یثرب سے گزرا۔ اس نے وہاں چند کم سن بچوں کو نشانہ بازی کرتے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بچہ جب اس کا تیر نشانے پر لگتا تو وہ فخر اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ نعرہ لگاتا ہے:

انا ابن هاشم، انا ابن سيد البطحاء

میں ہاشم کا بیٹا ہوں اور سید البطحاء کا فرزند ہوں

جب وہ شخص مکہ واپس آیا تو مطلب کے پاس گیا اور اس سے یہ سارا واقعہ کہہ سنایا اور ساتھ ہی اسے یہ کہا کہ یہ کوئی مناسب بات نہیں کہ ہاشم جیسے شخص کا بیٹا غریب الوطنی کی زندگی گزار رہا ہے۔ لہٰذا اسے اس کے ننھیال سے واپس بلا لو تاکہ وہ اپنے خاندان میں پل کر جوان ہو۔ مطلب نے وعدہ کیا وہ جلد از جلد یثرب جا کر اپنے بھتیجے کو واپس لائے گا۔

شیبہ کی عمر سات آٹھ سال کی ہوئی تو ان کے چچا مطلب نے مدینہ آ کر شیبہ کو مکہ مکرمہ لے جانا چاہا۔ اولاً ماں اور ماموں راضی نہ ہوئے بلکہ سختی سے انکار کیا لیکن جب مطلب نے ان کو سمجھایا کہ مدینہ میں اس بچے کی زندگی خراب ہو گی۔ مکہ میں اس خاندان کی بڑی عزت و تکریم کی جاتی ہے۔ ہاشم کے دوست احباب اور قدردان بھی ابھی موجود ہیں، اس لیے وہاں شیبہ کو ترقی کا بہت موقع ملے گا۔ یہ بات ان کے گوشۂ ذہن میں آ گئی اور وہ شیبہ کو مکہ بھیجنے کے لیے رضامند ہو گئے۔ چنانچہ مطلب اپنے یتیم بھتیجے کو اونٹ پر اپنے پیچھے

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ (قریش: ۳، ۴)

''قریش کو محبت دلانے کے سبب، انہیں سردی اور گرمی کے
(تجارتی) سفر سے مانوس کرنے کے سبب انہیں چاہیے کہ وہ اس گھر کے رب
کی عبادت کریں، جس نے انہیں بھوک میں کھانا کھلایا اور ان کو
خوف سے امن میں رکھا۔''

مکہ مکرمہ میں غلہ پیدا نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی وہاں باغات تھے کہ یہاں لوگوں کو پھل میسر آئیں، چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جو قرآنی دعا کی تھی اس کا ذکر سورۃ ابراہیم میں ہے۔ انہوں نے دعا کی تھی کہ ''اے اللہ! میں اپنی اولاد کو وادی غیر ذی زرع میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسا کر جا رہا ہوں۔ تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل فرما دے اور ان کو پھلوں میں سے رزق عطا فرما۔'' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اہل مکہ بڑے افلاس اور تکلیف میں رہے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے جد امجد ہاشم نے قریش والوں کو آمادہ کیا کہ وہ دوسرے ملکوں میں جا کر تجارت کریں، موسم گرما میں ملک شام اور موسم سرما میں ملک یمن میں تجارتی سفر کریں کیونکہ بیت اللہ اور حجاج کی خدمت کی وجہ سے تمام عرب میں یہ لوگ احترام و تقدس کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ تمام راستے ان کے لئے خطرات سے محفوظ تھے۔

اس لیے قریش یہ کرتے کہ سال میں دو بڑے تجارتی سفر کرتے۔ سردیوں میں یمن جیسے گرم علاقوں کی طرف اور گرمیوں میں شام جیسے ٹھنڈے علاقوں کی طرف سفر کرتے جو سرسبز و شاداب تھے۔ راستے کے قبیلوں اور دوسرے علاقوں کی راہداری کے محصول ان سے وصول نہ کیے جاتے اور نہ ہی ان کے مال و جان سے تعرض کیا جاتا بلکہ ہر جگہ کے لوگ ان کی خدمت کرتے، اور قریش حجاج کی خدمت چونکہ نہایت فیاضی سے کرتے تھے، اس لیے سب ہی ان کے احسان مند اور شکر گزار رہتے۔ بادشاہوں اور امراء سے بھی ان کے اچھے

اس روایت کو بغوی نے شرح السنۃ ۸/۲۲۵، بیہقی نے سنن کبریٰ ۶/۱۱۸، دلائل النبوۃ ۱/۳۵۵، کنز العمال ۳/۱۱۰، الکامل لابن عدی ۵/۲۰۳، طبقات ابن سعد ۱/۱۲۶، مسند ابی یعلیٰ ۱۸/۹۰ میں ابی ہریرہؓ روایت کیا ہے۔ وسندہ صحیح

مصر کے مشہور عالم اور سیرت نگار استاذ الاعصر فضیلۃ الشیخ استاذ ابو زہرہ نے قراریط کا مفہوم یہ لکھا ہے کہ:

القراریط هي حصة من اللبن كان يتغذى به مع اولاد ابي طالب.

''قراریط بکریوں کے دودھ کا وہ حصہ ہے جو سرکار دو عالم ﷺ اجرت کے طور پر لیا کرتے تھے اور وہ ابو طالب کے اہل و عیال کے لیے بطور غذا استعمال فرمایا کرتے تھے۔'' (خاتم النبیین ج ۱/ ۱۳۷)

اس سے معلوم ہوا کہ ابو طالب حضور ﷺ کی کفالت نہ کرتے تھے بلکہ سرکار دو عالم ﷺ آپ کے بچوں کی کفالت فرماتے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں بھی اپنے گھر والوں کی بکریاں مقام اجیاد میں چرایا کرتا تھا۔'' (فتح الباری ۴/۳۶۳)

بعض علماء نے یہاں یہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا بکریاں چرانا دنیا کی گلہ بانی کا مقدمہ اور تمہید ہوتی ہے۔ بکریاں چرانے میں گلہ بان کو ہر طرف نگاہ رکھنی پڑتی ہے کیونکہ بکریاں کچھ ایک طرف دوڑتی ہیں اور کچھ دوسری طرف۔ ان کو نظم و ضبط میں لانا نہایت مشکل اور دشوار ہوتا ہے۔ پھر ان کو بھیڑیوں اور درندوں سے بچانا بھی گلہ بان کے فرائض میں سے ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو چونکہ امت کا گلہ بان بننا ہوتا ہے اور امت کی صلاح و فلاح کی فکر میں شب و روز سرگرداں رہنا ہوتا ہے۔ امت کے افراد بھیڑ بکریوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتے پھرتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام ان کو ادھر ادھر بھاگنے سے روکتے ہیں، ان کو شریعت کے نظم و ضبط میں رکھتے ہیں اور ان کو شیطان اور نفس کے بھیڑیوں اور درندوں سے بچاتے ہیں۔ اس لیے بچپن میں ان سے بکریاں چرائی جاتی ہیں تاکہ انہیں ایک

ٹریننگ حاصل ہو جائے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے بچپن میں ہر دو سال کی عمر میں گلہ بانی کی اور بعض جوانی کی منزل میں بھی آپ کا بکریاں چرانا بیان کرتے ہیں۔ آپ نے کتنا عرصہ بکریاں چرائیں کسی اور روایت میں ہمارے علم کے مطابق اس کی تصریح نہیں ہے۔[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۲۵؛ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۶۰؛ عیون الاثر، ابن سید الناس ج ۱ ص ۴۳، سیرۃ حلبیہ ج ۱ ص ۱۲۵

نبی اکرم ﷺ اپنی عمر کی ۲۵ منزلیں طے کر کے عنفوان شباب میں تھے تو گلہ بانی سے آگے بڑھ کر آپ نے میدان تجارت میں قدم رکھا جو آپ کے آباء واجداد کا پیشہ تھا۔ تجارت کے میدان میں آپ کی آمد کا مقصد دولت اکٹھا کرنا نہیں تھا جیسا کہ عام تجار کا ہوتا ہے، کیونکہ آپ تو قناعت پسند طبیعت کے حامل تھے۔ گلہ بانی کی اجرت کا اندازہ لگائیے کہ چند قراریط یعنی چند قیراط کی اجرت اس معاشرہ میں کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی لیکن آپ دنیا کے تمام مادی میلانات اور رجحانات سے بے تعلق تھے۔ جب تک زندہ رہے دوسروں کو لعل و گہر بخشتے رہے لیکن اپنا چولہا کئی کئی ہفتے ٹھنڈا رہا۔ مولانا ظفر علی خان مرحوم نے سچ کہا:

ہیں دوسروں کے واسطے لعل و زر و گہر
اور اپنا یہ حال ہے کہ ہے چولہا بجھا ہوا

آپ کی طبیعت میں مال و دولت کے اندوختہ کی مناسبت ہی نہ تھی کہ آپ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا:

﴿نحن قوم لا نأكل حتى نجوع وإذا أكلنا لا نشبع﴾

"ہمارا تعلق اس طبقہ سے ہے جو اشتہاء سے قبل کھانے پر ہاتھ نہیں ڈالتا اور کبھی سیر شکم ہو کر نہیں کھاتا۔" (مجمع الزوائد)

اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ آپ نے خود بھی سادگی، تنگی، سختیوں اور مصیبتوں میں گزاری اور دوسروں کو بھی اس قسم کی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی۔

بخلاف ان لوگوں کے جو مال و دولت کے پیچھے بھاگتے ہیں تا کہ اس کے ذریعے

نفسانی خواہشات کی تکمیل نہ تھی۔ میدان تجارت میں قدم رکھنے سے آپ کی غرض حصول دولت نہ تھی بلکہ ایک تو کثیر العیال اور قلیل المال چچا ابو طالب کی اعانت و امداد تھی اور دوسرے دنیا کو دیانت و امانت، راست بازی اور سچائی اور صداقت کے اصول سکھانے تھے۔ تیسری غرض ایک اور بھی تھی اور وہ یہ تھی کہ چونکہ نبوت کے بعد آپ کو ایک بہت بڑا مشکل کام سونپا جانا تھا لہٰذا اپنے تعلقات میں وسعت پیدا کرنے اور لوگوں کو قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا تجربہ حاصل ہو۔

نبوت سے قبل بھی آپ کی زندگی ایک نہایت پاکیزہ زندگی تھی جس میں بد خلقی کا کوئی معمولی سا دھبہ بھی نہ تھا۔ لیکن تاریخ کی یہ پرانی عادت بہت ہی تکلیف دہ اور عجیب سی ہے کہ کسی شخص کی زندگی کے واقعات قلم بند کرنے کے لیے وہ اس وقت قلم اٹھاتی ہے جب وہ شخص تاریخی انسان بن چکا ہوتا ہے۔ اس سے قبل اس کے قلم کو جنبش نہیں ہوتی۔ اس نے یتیم مکہ اور نور نظر عبد اللہ اور سیدہ آمنہ کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے بارے میں بھی ایسا ہی بخل سے کام لیا اور ان تمام واقعات کو اپنے دامن میں سمیٹنے اور قلم کو زیر تحریر میں لانے سے محروم رکھا جو محمد رسول اللہ ﷺ کی روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے رہے اور جو قریش کے مردوں اور زنوں کو متاثر کرتے رہے۔ نہ صرف متاثر کرتے رہے بلکہ انہیں ان کا گرویدہ بنا دیا اور وہ آپ کا "الصادق" اور "الامین" کے سوا کوئی اور نام لینا بے ادبی سمجھتے تھے۔ یہ دونوں لفظ یہاں تک زبانوں پر چڑھ گئے کہ انہوں نے ایک قومی لقب کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں آپ کی ایک نہایت خوبصورت تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

> "محمد ﷺ نے جب عہد شباب میں قدم رکھا تو آپ انسانیت اور مروت کے اعتبار سے اپنی قوم میں سب سے زیادہ ممتاز، اخلاق میں سب سے اعلیٰ، حسن جوار میں سب سے زیادہ فرحت بخش، ہمسائیگی میں سب سے زیادہ کریم اور خوش گوار، حلم و تحمل وغیرہ، گفتگو میں صادق اور راست گو، فحش گوئی اور ایذا رسانی کی وصف سے دور بھاگنے والے، بردباری میں بے مثال، تواضع اور منکسر المزاجی میں باکمال،

بعض روایات میں ہے کہ آپ کے اوصافِ حمیدہ اور دیانت و امانت اور صدقِ مقال کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ سیدہ خدیجہ کا سامان قریش کے کل سامان کے برابر ہوتا تھا۔ وہ مضاربت پر لوگوں کو تجارت کے لیے بیرونِ مکہ اور شام بھیجتی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی اور آپ کو قوم کی جانب سے "الصادق" اور "الامین" کے القاب مل چکے تھے اور یہی وہ صفات ایک تاجر کی تجارت کے فروغ کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہیں۔ آپ کے ان اوصاف کا گھر گھر چرچا ہوا۔ اس بنا پر سیدہ خدیجہ نے خود آپ کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ میرا مالِ تجارت شام لے کر جائیں تو آپ کو دوسروں کی نسبت زیادہ حصہ دوں گی۔ آپ نے سیدہ کے اس پیغام کو قبول فرمالیا اور سیدہ خدیجہ کے غلام میسرہ کے ساتھ آپ شام کی جانب مال لے کر روانہ ہوئے۔ شام ہونے سے قبل سیدہ خدیجہ نے آپ سے یہ کہا کہ میں آپ کی قوم کے دوسرے تاجروں کو جو نفع یا حصہ دیتی ہوں، آپ کو اس سے دگنا دوں گی۔ آپ نے اس کو منظور فرمایا اور گھر آکر اپنے چچا ابوطالب سے بھی اس کا ذکر کیا یہ سن کر ابوطالب بہت خوش ہوئے۔ (۱۔ عیون الاثر لابن سید الناس ۱/۹۹۔ ۱۱۷)

بعض روایات میں ہے کہ سیدہ نے اپنے غلام میسرہ کو جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ روانہ کیا تو نہایت تاکید سے فرمایا: میسرہ! خبردار ان کی نافرمانی نہ کرنا اور نہ ہی ان کی رائے کی مخالفت کرنا۔"

غرض کہ آپ سیدہ خدیجہ طاہرہ کا مال لے کر غلام میسرہ کی معیت میں ۱۶ ذی الحجہ کو شام روانہ ہو گئے۔ آپ کے چچاؤں نے قافلہ والوں کو سخت تاکید کی کہ محمد ﷺ کی حف حفاظت کرنا ایسا نہ ہو کہ انہیں کسی دشمن سے کوئی گزند پہنچے۔ راستہ میں آتے جاتے میسرہ برابر دیکھتا رہا کہ جب گرمی کی شدت ہوتی تھی تو جھٹ بادل آکر آپ پر سایہ فگن ہو جاتا تھا۔ میسرہ یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوا اور اس کے دل میں آپ کی محبت اور عقیدت جاگزیں ہو گئی۔

جب واپسی پر آپ مرالظہران پہنچے جو مکہ اور عسفان کے مابین ایک وادی ہے تو آپ سب سے آگے تھے یہاں تک کہ ظہر کے وقت آپ مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ اس

وقت سیدہ خدیجہ چند خواتین کے ساتھ اپنے بالا خانہ میں بیٹھی ہوئی باہر کا نظارہ کر رہی تھیں۔ ان خواتین میں نفیسہ بنت منیہ بھی موجود تھیں۔ سیدہ خدیجہؓ اور دوسری خواتین نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دو پرندے رحمتِ عالم محمد ﷺ کے سر پر سایہ کر رہے ہیں یہ نظارہ دیکھ کر وہ انگشت بدنداں رہ گئیں۔ ظاہر ہے کہ وہ فرشتے تھے جو پرندوں کی شکل میں متمثل تھے۔

بعض روایات میں ہے کہ شام کے سفر میں سیدہ خدیجہ کا اپنے غلام میسرہ کو آپ کے ساتھ بھیجنے کا بہانہ یہ تھا کہ وہ سفر میں آپ کی خدمت کرتا رہے گا لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ وہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے طور و اطوار کا گہری نظر سے مطالعہ کرتا رہے۔ سرورِ کائنات ﷺ جب اپنی تجارت میں دوسروں سے بہت زیادہ منافع کما کر واپس تشریف لائے تو سیدہ بہت خوش ہوئیں لیکن سب سے زیادہ خوشی آپ کو سرورِ کائنات کے اوصافِ حمیدہ اور خصائلِ پسندیدہ کو سن کر ہوئی جو میسرہ نے سیدہ سے بیان کیے اور آپ کی دیانت داری اور راست گفتاری کی ایسی تعریف کی کہ سیدہ نے دامنِ محمد ﷺ سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے کا عزمِ صمیم کر لیا۔

سیدہ خدیجہ مکہ مکرمہ کی رہنے والی خاتون تھیں جو ۴۰ سال کے پیٹے میں تھیں۔ (یہ عام روایت ہے لیکن ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کی تحقیق ہے کہ سیدہ کی عمر بھی اس وقت سرورِ دو عالم کے برابر تھی اور ایک روایت میں سیدہ کی عمر ۲۸ سال تھی۔ (ذکرہ ابن کثیر من روایت ابن عساکر عن ابن عباس، حافظ ابن عساکر دمشقی ص ۶ ج ۵۵ طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۷) (ہمارے خیال میں ۲۸ برس والی روایت زیادہ صحیح ہے کیونکہ ۴۰ برس کی عورت اتنی اولاد پیدا نہیں کر سکتی جتنی سیدہ نے کی) سیدہ جس شخص سے شادی کا ارادہ کر چکی تھی وہ حسب و نسب میں تمام مکہ والوں سے اعلیٰ اور افضل تھا، صورت و سیرت میں بے مثال، اخلاق و عادات میں باکمال، گویا کہ دو جہان کی خوبیاں اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات میں جمع کر رکھی تھیں۔ ایسا حقیقی ہیرا انہیں کہاں ملنے والا تھا۔ سیدہ ایک تاجرہ تھیں۔ تجارت میں بھی وہ اس نوجوان کی کاروباری صلاحیتوں، دانشمندی، ہوشیاری اور مستعدی دیکھ چکی تھیں۔ اگرچہ اس

نوجوان کے پاس دولت کے انبار نہیں تھے لیکن سیدہ کی نگاہ ان کی ان خوبیوں کی طرف
تھی جن کے مقابلے میں دولت وثروت کی حیثیت ایک پرکاہ سے زیادہ نہ تھی۔ دولت
کے انبار رکھنے والے خود سیدہ کو نکاح کی دعوت دے چکے تھے لیکن ان کی دعوت
نکاح سیدہ نے ٹھکرا دیے تھے۔ اب سیدہ کی نگاہیں آپ کی ذات ستودہ صفات میں خود
بخود مرکوز ہو چکی تھیں اور وہ اس کوشش میں تھیں کہ جلد از جلد کوئی اس رشتہ کے لیے سلسلہ
جنبانی کرے۔ یہ سب کچھ سرکار دو عالم ﷺ کی نیک نفسی، امانت، پاکیزگی، صداقت،
دیانت داری اور عمدہ وصف کی وجہ سے ہوا جو تجارت کے لازمی اجزاء ہیں۔ چنانچہ سیدہ سے
آپ کا نکاح سفر شام سے واپسی کے دو ماہ ۲۵ روز بعد ہوا۔[1]

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے [illegible] ۱۹۹۰ [illegible] ص ۲۲ [illegible]
[illegible]

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ایک تاجر میں نہایت اعلیٰ اخلاقی صفات کا ہونا
ضروری ہے اور رسول اللہ ﷺ انہی صفات سے متصف تھے ورنہ کیا وجہ تھی کہ ذہین اور تجربہ کار تاجرہ
سیدہ طاہرہ آپ کے حبالۂ عقد میں آگئیں حالانکہ آپ کو تجارت کا کوئی سابقہ تجربہ نہ تھا اور
تجارت کا سابقہ تجربہ رکھنے والے بڑے بڑے تاجر سیدہ کی اس میدان کے پورے تاجر تھے
اور ان کی دعوت نکاح کو سیدہ نے ٹھکرا دیا تھا۔

سوشل اور تجارتی بائیکاٹ

تجارت کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب کسی قوم یا فرقہ کو
نقصان پہنچانا مقصود ہو تو اس کا سوشل اور تجارتی بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے جیسا کہ قریش مکہ نے
مسلمانوں کا کیا۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ جب مسلمان قریش مکہ کے مظالم سے تنگ
آکر حبشہ ہجرت کر گئے تو قریش نے ان کو واپس لانے کے لیے ایک سفارتی وفد شاہ
حبشہ نجاشی کے پاس بھیجا جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب "سیرت خاتم النبیین ﷺ" میں
دی ہے۔ یہ سفارتی وفد ناکام واپس لوٹا۔ سفارت کی اس ناکامی اور سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ اور

گھاٹی میں بھجوا دیتے۔ ابوجہل کو پتہ چلا تو وہ دشمن اسلام جست سوار ہو کر پہنچا اور غلام کا راستہ روک کر کھینچ لگا: ''میں تمہیں ہاشمیوں کے پاس گیہوں نہ لے جانے دوں گا اور سارے مکہ میں تمہیں ذلیل و رسوا کردوں گا۔ اتفاق سے ابوالبختری بن ہشام بن حارث نامی ایک غیر مسلم دشمن وہاں آ گیا اور ابوجہل سے پوچھنے لگا کیا قصہ ہے؟ ابوجہل نے کہا کہ ''یہ حکیم بن حزام کا غلام محمد ﷺ کیلئے گیہوں لے جا رہا ہے اور میں اسے روک رہا ہوں'' ابوالبختری نے کہا: ''اے ابو الحکم! حکیم بن حزام کی پھوپھی کا غلہ ہے جو ان کے پاس امانت رکھا ہوا تھا وہ اس نے منگوایا ہوگا۔ جانے دو اس میں کوئی حرج نہیں۔'' ابوجہل نے کہا ''میں یہ گیہوں کسی صورت نہیں جانے دوں گا۔'' ابوالبختری نے کہا ''ایک شخص اپنی پھوپھی کی امانت واپس کرنا چاہتا ہے مگر تیری شقاوت اور سنگدلی اس کی اجازت بھی نہیں دیتی۔'' ابوجہل کو یہ سن کر غصہ آ گیا چنانچہ ابوجہل اور ابوالبختری میں تلخ کلامی ہوئی اور پھر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ ابوالبختری نے ابوجہل کے اونٹ کی گردن پکڑ کر زور سے مروڑی اور جھٹکا دے کر اونٹ کو بٹھا لیا پھر ابوجہل کو گردن سے پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچا۔ پھر اونٹ کی ہڈی اٹھا کر اس زور سے ابوجہل کے سر پر ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا اور خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ لیکن ابوالبختری نے اسے پھر بھی نہ چھوڑا۔ خوب ٹھوکریں اور ٹھڈے مارے اور بری طرح ذلیل و خوار کیا۔ مارنے سے زیادہ ابوجہل کو تکلیف اس سے پہنچی کہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ شعب بنو ہاشم سے اس کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تجارت ایک قوم کیلئے بہت ضروری چیز ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو قوم بدحال اور خستہ حال ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے خود بھی تجارت کی اور لوگوں کو بھی تجارت کرنے کی ترغیب دی کیونکہ معاشیات کی مضبوطی قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ اور قوموں کی خوشحالی اور فارغ البالی اور خوش حالی تجارت ہی سے ہوتی ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ہجرت مدینہ کے بعد قریش مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی کرنے کی کوشش کی جو کہ جنگ بدر کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ ہجرت مدینہ کے بعد جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تو اسے حتمی طور پر مسلمانوں کا قبلہ کعبہ کو قرار دیا گیا۔ تحویل کعبہ کے

اس حکم سے مسلمانوں کا رشتہ خانہ کعبہ کے ساتھ اور بھی مضبوط اور پختہ کر دیا گیا۔

اس متمدن اور مہذب دنیا کے اندر بھی کسی مطالبہ کو تسلیم کرانے کا پرامن طریقہ اقتصادی ناکہ بندی ہے۔ مدینہ منورہ کی بیدار مغز قیادت نے یہ طریقہ استعمال کیا۔ چنانچہ مختلف سرایا اور غزوات میں قریش کے تجارتی قافلوں کے تعاقب میں جو دستے روانہ ہوئے ان کا منشا اور مقصد صرف یہ تھا کہ قریش کو مجبور کر دیا جائے تاکہ مسلمانوں کا مکہ میں داخلہ بے خطر ہو سکے لیکن قریش مکہ کو مسلمانوں کی یہ بیدار مغزی اور جسارت کب برداشت ہو سکتی تھی۔

مسلمان جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ گئے تو قریش نے اہل مدینہ کو یہ حکم دیا تھا کہ محمد ﷺ سے جنگ کرو یا پھر انہیں اپنے ہاں سے نکال دو ورنہ تمہارے نوجوانوں کو قتل اور تمہاری عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جائے گا۔ اہل مدینہ نے قریش کا یہ حکم بالکل تسلیم نہ کیا۔ اب قریش کیلئے یہ وقار کا سوال ہو گیا تھا کیونکہ اب اگر وہ مدینہ پہنچ کر ان کے نوجوانوں کو قتل اور عورتوں کو لونڈیاں نہ بناتے تو ان کے وقار اور عزت کی پوری عمارت دھڑام سے زمین پر آ گرتی تھی اور سرزمین عرب میں ان کی تسلیم شدہ عظمت وقیادت خطرے میں پڑ جاتی تھی لیکن اب مسلمانوں کی پوزیشن وہ نہیں تھی جو زعیم قریش ابوجہل سمجھتا تھا کیونکہ سرکار دو عالم ﷺ نے مدینہ منورہ پہنچتے ہی جو سیاسی تدابیر اختیار کی تھیں اور ہمسائے باہمی کے اصول پر معاہدات کا جال پھیلا کر ظاہر بینوں کیلئے مادی اسباب میں بھی ایک طاقت اور قوت بنائی تھی اس نے قریش کو باور کرا دیا کہ مسلمان اتنا تر لقمہ نہیں ہیں کہ ان کو آسانی کے ساتھ نگلا جا سکے بلکہ اب انہیں مکمل تیاری کر کے مدینہ کا رخ کرنا چاہیے۔

جنگ کی تیاری کے لیے سرمایہ کی ضرورت تھی اور اتنا سرمایہ ان کے پاس اگرچہ تھا لیکن کفر کے بخل کی وجہ سے وہ اتنا سرمایہ لگانا نہیں چاہتے تھے۔ چندہ اکٹھا کرنا انہوں نے مناسب نہ سمجھا لہٰذا منصوبہ یہ بنایا گیا کہ چندہ کے بجائے تجارت کے ذریعہ سرمایہ اکٹھا کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ سوچا گیا کہ ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ شام بھیجا جائے۔ اس تجارتی قافلہ میں مکہ کا ہر شخص خواہ وہ عورت ہو یا مرد سرمایہ لگائے اور اس سے جو منافع حاصل ہو اس

کو مسلمانوں کے خلاف جنگ میں صرف کیا جائے۔ چنانچہ تجارت کے نام پر قریش کے ایک ایک فرد نے اس قافلہ میں اپنا مال لگایا۔ عورتیں جو تجارت میں بہت کم حصہ لیتی ہیں۔ انہوں نے بھی اس میں اپنی رقم لگائی۔ صرف ایک شخص ایسا تھا جو اس سے الگ رہا۔ اس کا نام حویطب بن عبدالعزیٰ تھا۔ [البدایہ والنہایہ ۳: ۲۵۶]

انتقام کے جذبے کے تحت جس شخص کے پاس تھوڑی سے تھوڑی رقم بھی تھی اس نے بھی وہ اس تجارتی قافلہ میں لگا دی۔ چنانچہ ابوسفیان جو اس تجارتی قافلہ کے سردار تھے، انہوں نے خود بیان کیا ہے کہ

﴿ما من قریشي ولا قرشية له نش فصاعداً لا بعث به معنا﴾

"قریش کے کسی مرد یا عورت کے پاس ایک نش یا اس سے بھی کم تھا تو اس نے وہ بھی ساتھ دے دیا" [طبقات ابن سعد ۲: ۲۷]

نش اوقیہ یا بیس درہم کا ہوتا ہے جس کا وزن پونے چار تولے چاندی ہوتا تھا۔ اس طرح مجموعی رقم جو اکٹھی ہوئی اس کی مالیت پچاس ہزار دینار تھی۔ اس لحاظ سے دو لاکھ اٹھارہ ہزار سات سو پچاس تولے سونا اس قافلہ کا سرمایہ تھا جو آج کل کے حساب سے قریب دس کروڑ بنتا ہے۔

قریباً ہر قبیلہ کا نمائندہ اس میں شریک ہوا۔ اس طرح صرف سربراہوں کی تعداد چالیس اور ایک روایت کے مطابق ستر تھی۔ [زرقانی ج۱ ص ۴۰۶]

ابوسفیان کو اس قافلہ کا منتظم مقرر کیا گیا کیونکہ انہیں تجارتی قافلوں کا زیادہ تجربہ تھا۔ اتنے سرمایہ کا سازوسامان لے کر یہ قافلہ مکہ سے شام کی جانب روانہ ہوا۔

اتنا بڑا قافلہ جس میں پچاس ہزار کا سازوسامان تیار کیا گیا ہو اور ایک ہزار اونٹ اور قریش کے چالیس سے ستر اکابر کے ہاتھ میں اس کی زمام کار ہو تو اس کا مکہ سے نکل کر شام جانا کوئی سربستہ راز نہیں ہو سکتا۔ اس کی خبریں مدینہ میں بھی پہنچ رہی تھیں۔ اور قدرتی بات ہے کہ یہ خبریں اہل مدینہ کے دلوں میں خوف و ہراس کی لہریں پھیلا رہی تھیں۔ لہٰذا

نبوی بصیرت نے قریش کے اس تجارتی منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے غزوہ عشیرہ میں
ڈیڑھ سو یا دو سو مہاجرین کی معیت میں خود اس کا تعاقب کیا لیکن آپ کے عشیرہ پہنچنے سے
پہلے وہ قافلہ وہاں سے جا چکا تھا۔ اس طرح وہ آپ کی گرفت سے بچ نکلا تھا۔ رمضان
المبارک میں پھر یہی قافلہ بے شمار مال و دولت سے لدا پھندا واپس مکہ مکرمہ آ رہا تھا۔ آپ کو
اس کی واپسی کی اطلاع ملی تو آپ نے سیدنا طلحہ بن عبید اللہ اور سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہما کو
اس کے حالات کا پتہ چلانے کے لیے شام کی جانب روانہ فرمایا۔ یہ دونوں صحابی مقام حوراء
تک گئے۔

سرکار دو عالم ﷺ کا یہ اقدام ہر لحاظ سے مناسب تھا۔ یہ اقدام جوش مارنے میں
تہور نہیں ہوا بلکہ یہ اقتصادی ناکہ بندی کہلاتا ہے۔ یوں کہ اپنے آپ کو دشمن کے شر سے بچانا
نہایت ضروری ہے۔ قریش کے عزائم اچھے نہیں تھے۔ انہوں نے تمام اہل مدینہ کو الٹی میٹم
دے دیا تھا کہ اگر انہوں نے محمد (ﷺ) کو مدینہ سے نہ نکالا تو تمہارے نوجوانوں کو موت
کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ قریش اگر مدینہ پر حملہ کرتے تو صرف مسلمان ہی ان کے ظلم و
ستم کا نشانہ نہ بنتے بلکہ مدینہ کے تمام باشندے اور یہود بھی ان کے حملہ کا ہدف ہوتے۔
ایک باحوصلہ بہادر اور بیدار مغز قائد کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے آدمیوں
کا بلکہ اپنے حلیف اور معاہد شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کا انتظام بھی کرے۔ جنگی
تدابیر، لڑائی کے پینترے اور اسٹریٹجی (Strategy) اور مقابلہ کی چالیں وہ قابل قدر
خوبیاں ہیں جو ایک بہادر اور بیدار مغز جرنیل کے کمالات میں شمار ہوتی ہیں۔ سیدنا سعد بن
معاذ انصاری رضی اللہ عنہ رئیس اوس مکہ مکرمہ میں ابوجہل کو چیلنج دے کر آئے تھے کہ "ہم
تمہاری تجارت کا راستہ بند کر دیں گے۔" اس کو کامیاب کرنے کا سب سے اہم اور سب
سے زیادہ موثر وقت یہی تھا چنانچہ آپ نے بروقت، برمحل اور بجا طور پر قصد فرمایا کہ اس
قافلہ کا راستہ روکا جائے۔

تجارتی قافلہ کی واپسی شام سے کب ہوگی اور کس راستے سے واپس ہوگا۔ اس
کا علم کسی کو نہ تھا۔ جانے کا راستہ تو معلوم تھا لیکن اس بات کا قوی امکان تھا کہ واپسی کا راستہ

تبدیل ہو جائے اور مدینہ طیبہ کے قریب سے گزرنے کے بجائے اس شاہراہ سے گزرے جو ساحل سمندر کو چھوتی ہوئی ینبع کے قریب سے بدر کی جانب مڑتی ہے۔ بدر ایک جنکشن تھا جہاں مدینے کو بھی راستہ جاتا تھا اور مکہ مکرمہ کو بھی، لہٰذا سرکار دو عالم ﷺ نے دونوں طرف آدمی بھجوا دیئے۔ بسبس بن عمرو جہنی کو بدر کی جانب اس راستے پر بھیجا اور عدی بن ابی الزغباء کو اس راستے پر جو مکہ کو جاتا تھا، اور سیدنا طلحہ بن عبید اللہ اور سیدنا سعید بن زید کو شام کی جانب روانہ کیا۔ (البدایہ والنہایہ ۳: ۲۴۲)

دس روز گزر گئے لیکن یہ حضرات مدینہ واپس نہ پہنچے۔ البتہ بسبس بن عمرو جہنی جن کو مکہ مکرمہ کی طرف جانے والے راستے پر بھیجا گیا تھا وہ واپس تشریف لائے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سیدنا بسبس رضی اللہ عنہ جب واپس پہنچے تو انہوں نے تنہائی میں سرکار دو عالم ﷺ سے ملاقات کی اور اس وقت آپ ﷺ کے اور میرے سوا گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ (البدایہ والنہایہ ۳: ۲۷۲)

تنہائی میں کیا باتیں ہوئیں، تاریخ کے اوراق اس بارے میں خاموش ہیں۔ البتہ اس کے فوراً بعد سرکار دو عالم ﷺ نے روانگی کا حکم دیا اور روانگی کا اعلان کچھ اس طرح کیا کہ "جن کی سواریاں یہاں موجود ہیں وہ ہمارے ساتھ چلیں۔" گویا جانے میں عجلت کا اظہار فرمایا۔ انصار کے پاس سواری کے اونٹ تو تھے لیکن رسول اللہ ﷺ ان کو لے کر اتنی جلدی مدینہ طیبہ سے نکلے کہ وہ اونچی چراگاہوں سے جو کہ مدینہ طیبہ کے گردونواح میں آٹھ میل تک پھیلی ہوئی تھیں، اپنے اونٹ نہ لا سکے۔ انہوں نے بارگاہ رسالت میں عرض بھی کیا کہ وہ اپنے اونٹ اونچی چراگاہوں سے لے آئیں لیکن انہیں اجازت نہ ملی۔

(ملاحظہ ہو بخاری، عمدۃ القاری ومسند امام احمد بن حنبل وغیرہ)

مدینہ طیبہ سے اس طرح دفعتاً روانگی کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ناگوار بھی گزری کیونکہ وہ فراست نبوی کو نہ سمجھ سکے تھے اور دوسرے قریش کے قافلہ کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کا جو نقشہ ان کے ذہنوں میں تھا یا ان سے جو بیان کیا گیا تھا اس سے بھی وہ خائف تھے۔ اسی بات کو قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

۱۲ رمضان، تبارک ۲ھ میں اتوار کے روز آپ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اور جمعہ کے روز غزوہ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ گویا چار پانچ روز میں آپ ﷺ نے قریباً ۸۰ میل کی مسافت طے کی جو کہ اس سے زیادہ دنوں میں طے کی جاتی تھی۔ یہ تیز رفتاری صرف اس لیے اختیار کی گئی تاکہ اس تجارتی قافلے کا مال ضبط کیا جا سکے جو بعد میں مسلمانوں کے مقابلہ میں جنگ میں کام آتا تھا۔ آپ کا اس طرح بے سروسامانی کی حالت میں نکلنا اس بات کی صاف غمازی کرتا ہے کہ آپ جنگ کے لیے نہیں نکلے تھے بلکہ قریش کے تجارتی قافلے کے تعاقب اور جستجو میں اتنی تیز رفتاری سے آئے تھے۔

سیدنا بسیس بن عمرو رضی اللہ عنہ اور سیدنا عدی بن ابی الزغباء رضی اللہ عنہما کو پہلے قافلہ کا پتہ چلانے کے لیے بھیجا گیا۔ یہ دونوں حضرات بدر پہنچ کر ایک ٹیلے کے قریب ٹھہر گئے۔ پھر بدر کے چشمے پر گئے۔ مجدی بن عمرو جہنی یہاں کا رئیس تھا۔ وہ بھی چشمے پر موجود تھا۔ وہاں دو لونڈیاں بھی پانی بھرنے آئی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک نے دوسری سے قرض لی ہوئی تھی چنانچہ وہ دوسری عورت کو پکڑے ہوئے اپنے قرض کا مطالبہ کر رہی تھی۔ مقروض لونڈی نے اس کو یہ کہہ کر یقین دلایا کہ کل پرسوں قریش کا ایک تجارتی قافلہ آنے والا ہے۔ میں اس میں محنت مزدوری کر کے کچھ رقم جمع کروں گی اور تمہارا قرضہ ادا کر دوں گی۔ مجدی بن عمرو جہنی نے اس تجویز پر ان کا جھگڑا ختم کرا دیا۔ (ابن ہشام ج ۲ ص ۶۱۲)

رسول اللہ ﷺ کے ان دونوں صحابہ نے ان عورتوں کی باتوں کو سن لیا اور وہ تمام معلومات ان سے اخذ کر لیں جو انہیں درکار تھیں۔ ان دونوں بزرگوں نے بھی اپنے اونٹوں کو پانی پلایا اور سیدھے سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوری رپورٹ پیش خدمت کی۔ ان کی رپورٹ سے یہ معلوم ہو گیا کہ ابوسفیان کا قافلہ ابھی بدر سے نہیں گزرا۔

ابوسفیان ایک ہوشیار اور بیدار مغز تاجر تھے اور وہ صرف تاجر ہی نہیں تھے بلکہ ایک دوراندیش جرنیل اور صاحب ہوش سیاسی لیڈر بھی تھے۔ اسی وجہ سے قریش نے انہیں اس تجارتی قافلہ کا رئیس بنایا تھا۔ ابوسفیان کو اس بات کا علم تھا کہ قریش نے مسلمانوں سے جنگ کا

قریب اونٹ بٹھایا پھر اس طرف آئے، پانی بھرا اور واپس چلے گئے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھے؟"

ابوسفیان کو ان دونوں حضرات کے بارے میں شبہ ہوا اور فوراً وہاں گیا جہاں ان دونوں نے اونٹ بٹھایا تھا۔ وہاں کچھ مینگنیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک مینگنی کو اٹھا کر توڑا تو اس میں سے ایک گٹھلی نکلی۔ اس نے جونہی گٹھلی دیکھی تو گھبرا کر بولا:

﴿هذا والله علائف يثرب﴾

"اللہ کی قسم یہ تو یثرب کے چارے کی گٹھلی ہے۔"

پھر فوراً قافلہ میں پہنچا اور رفقائے قافلہ کو بتایا اور اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ کو ہو لیا۔ جب آگے چل کر پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ قافلہ مسلمانوں کی دست برد سے محفوظ ہو گیا ہے تو ابوجہل کو پیغام بھیج کر قافلہ بچ کر محفوظ ہو گیا ہے چنانچہ آپ لوگ بھی جنگ کا ارادہ ترک کر کے واپس چلے جائیں۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ جب میدان بدر میں فریقین کا مقابلہ ہوا تو ابوسفیان کا قافلہ بحر قلزم میں سمندر کے کنارے کنارے نکل چکا تھا۔

ایک طرف تو ابوسفیان نے قافلہ کو اس تدبیر سے مسلمانوں کی دست برد سے محفوظ کر لیا۔ دوسری طرف اس نے حفظ ما تقدم کے طور پر ایک شخص ضمضم بن عمرو غفاری کو سونے کے بیس مثقال دیے جن کا وزن آج کل کے حساب سے ساڑھے سات تولے ہوتا ہے اور اس کو یہ پٹی پڑھائی کہ وہ فوراً مکہ پہنچ کر اپنے اونٹ کی ناک کاٹ دے، اپنے تمام کپڑے پھاڑ کر برہنہ ہو جائے، اونٹ پر الٹا بیٹھ کر (یعنی منہ دم کی طرف کرتے ہوئے) مکہ شہر میں شور مچاتا ہوا داخل ہو جائے اور یہ آواز لگائے کہ محمد (ﷺ) نے ابوسفیان کے تجارتی قافلے پر حملہ کر دیا ہے۔ ضمضم خود بھی بہت ہوشیار اور چالاک آدمی تھا۔ لہٰذا اس نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے ابوسفیان کی اس تدبیر پر عمل کیا۔ یہ طریقہ عرب میں اس زمانہ میں لوگوں کو ہوشیار کرنے کا ہوتا تھا۔

ضمضم مکہ آیا اور اس نے وہی کچھ کیا جو ابوسفیان نے اس سے کہا تھا۔ یہ خبر جنگل

مغربی دنیا کے اس خیال کی کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، ان الفاظ میں تردید کی ہے۔

"جیسے اسلام نہایت تیزی سے دنیا میں پھیلا بالکل اتنی تیزی سے اور کوئی مذہب دنیا میں نہیں پھیلا۔ مغرب کا یہ نظریہ کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، بالکل غلط ہے اور جدید اسکالرز اور دانش ور اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام نے حریت فکر پر زور دیا ہے۔"

(Islam the Misunderstood Religion, Reader Digest, May, 1955)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی عفو و درگزر کی صفت کو علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

"مکہ جب فتح ہوا تو حرم کے صحن میں، کس حرم کے صحن میں، جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دی گئیں، آپ پر نجاستیں پھینکی گئیں۔ آپ کے قتل کی تجویز منظور ہوئی۔ قریش کے تمام سردار مفتوح کھڑے تھے، ان میں وہ بھی تھے جو آپ کو جھٹلایا کرتے تھے، وہ بھی تھے جو آپ کو ستانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے، وہ بھی تھے جو خود اس پیکر قدسی کے ساتھ گستاخیوں کا حوصلہ رکھتے تھے، وہ بھی جنہوں نے آپ پر پتھر پھینکے تھے۔ آپ کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے۔ آپ پر تلواریں چلائی تھیں، وہ بھی تھے جنہوں نے آپ کے عزیزوں کا خون ناحق کیا تھا، ان کے سینے چاک کیے تھے، ان کے دل و جگر کے ٹکڑے کیے تھے، وہ بھی تھے جو غریب اور بے کس مسلمانوں کو ستاتے تھے، ان کو تپتی ریتوں پر لٹاتے، دہکتے کوئلوں سے ان کے جسموں کو داغتے تھے، نیزوں کی انی سے ان کے بدن کو چھیدتے تھے، آج یہ سب مجرم سرنگوں تھے، پیچھے دس ہزار خون آشام تلواریں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارہ کی منتظر تھیں۔"

(خطبات مدراس، خطبہ ششم: سیرت محمدی کی جامعیت)

تجارت کی اہمیت

وسائل معیشت میں افضل ترین وسیلہ "تجارت" ہے۔ بعض سلف میں اختلاف
پایا جاتا ہے کہ سب سے افضل تجارت ہے یا زراعت، امام شافعی کے نزدیک تجارت افضل
ہے اور امام ابوالحسن ماوردی وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ زراعت افضل ہے۔ امام نووی کی رائے
یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے کمانا افضل ہے اور اس میں زراعت بھی شامل ہے۔ صاحب
بحرالرائق فرماتے ہیں کہ احناف کے نزدیک جہاد کے بعد معیشت کا افضل طریقہ تجارت
ہے۔ پھر زراعت ہے اور پھر صنعت و حرفت ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ معیشت کے تین
ذرائع ہیں: تجارت، زراعت اور اجارہ (ملازمت) اور ہر ایک کے فضائل میں بہت
احادیث آئی ہیں۔ بعض حضرات نے اس میں صنعت و حرفت کو بھی شامل کیا ہے۔ لیکن بعض
حضرات کے نزدیک صنعت و حرفت کمائی کے سبب میں شامل نہیں ہوتے اس لیے کہ صرف
صنعت و حرفت کمائی نہیں ہے کیونکہ اگر کوئی شخص برتن بناتا ہے تو وہ برتن بنا کر اپنی دکان
پر رکھتا ہے۔ اس سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی جب تک وہ ان برتنوں کو فروخت نہ کرے یا پھر
کسی کے پاس ملازم ہو کر برتن بنانے کی اجرت نہ لے۔ اس وجہ سے یہ دونوں طریقے تجارت
اور اجارہ میں آگئے۔ غرضیکہ اسباب معیشت میں سب سے افضل سبب تجارت ہے۔ اس لیے
رسول اللہ ﷺ نے اپنی احادیث میں اس کی بڑی تعریف کی اور آپ نے خود بھی تجارت
کی اور تجارت کو پسند فرمایا۔ اس وجہ سے تجارت اسلامی نظام معیشت کا جزو اعظم ہے۔ لہٰذا
ایک اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ اس کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرے
بلکہ موجودہ زمانہ میں تو تجارت کو ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے اور دنیا میں تمام امیر ملک تجارت
کی وجہ سے امیر ہوئے ہیں نہ کہ زراعت کی وجہ سے، چنانچہ [illegible] نے لکھا ہے:

"اس دنیا میں تجارت تمام وسائل انسانی میں سب سے بڑا وسیلہ
معاش ہے اور تمدن و حضارت کے اسباب میں سب سے بڑا

سبب ہے۔

اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے تجارت کی بڑی ترغیب دی ہے کیونکہ اقتصادی اور معاشی نظام کی ترقی کا راز سب سے زیادہ تجارت ہی میں مضمر ہے۔ جو قوم جس قدر تجارت میں دلچسپی لیتی ہے وہ اسی قدر معاشی اور اقتصادی ترقی کی منازل طے کرتی ہے۔ جس ملک اور قوم کے باشندے اس زمانہ میں تجارت میں دلچسپی نہیں رکھتے وہ اقتصادی میدان میں ہمیشہ دوسروں کے دست نگر رہتے ہیں اور اسی راستہ سے دوسری قومیں ان کے تمدن، تہذیب، معیشت، اقتصادیات اور سیاست پر قابض ہو جاتی ہیں اور ان کو غلام بنا کر ان پر مطلق العنان حکومت کرتی ہیں جیسا کہ برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں نے قبضہ کیا اور ہندوستان کے باشندے قریباً دو سو سال تک انگریزوں کے زیر دست غلام بن کر رہے۔ انگریز ہندوستان میں تجارت ہی کی غرض سے آیا تھا اور آج بھی امریکہ اور یورپی ممالک اسی راہ سے دنیا پر اپنے پنجے مضبوط کر رہے ہیں۔ عراق کے تیل پر قبضہ کرنے کیلئے امریکہ نے وہاں ایک خون کی ہولی کھیلی اور ابھی تک کھیل رہا ہے کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ جو قوم تجارت نہیں کرتی وہ ترقی نہیں کر سکتی ضرور غلام بن کر رہے گی اور جو ملک تجارت کی برکات سے محروم ہے وہ جلد ہی قعر مذلت و پستی میں گر کر تباہ و برباد ہو جائے گا۔

زراعت کی اہمیت

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اسلام میں زراعت کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اسلام میں زراعت کا بھی بہت بڑا مقام ہے لیکن تجارت کی اہمیت زراعت سے زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی دنیا پر زرعی پیداوار کو ایک عظیم الشان احسان جتلایا ہے کہ انسانی بقاء کے وسائل معیشت میں زراعت کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے۔

﴿أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ ۝ أَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ﴾

ہے وہ اس کا صدقہ ہو جاتا ہے جو کچھ اس میں سے چوری ہو وہ اس کا
صدقہ ہو جاتا ہے اور جو درندے کھا لیں وہ بھی اس کا صدقہ ہو جاتا
ہے اور جو پرندے کھا لیں وہ بھی اس کا صدقہ ہو جاتا ہے اور جو شخص
اس میں سے کم کرے گا وہ اس کا صدقہ ہو جائے گا۔“؎ مسلم رقم ۳۹۴۸

اسی مضمون کی ایک اور روایت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”جو مسلمان بھی کوئی درخت لگاتا ہے یا کوئی کھیت لگاتا ہے اس سے
کوئی پرندہ، انسان یا چوپایہ کھاتا ہے تو وہ اس کا صدقہ ہو جاتا ہے یعنی
اس کیلئے اجر و ثواب کا باعث بنتا ہے۔“

؎ مسلم رقم ۳۹۵۰، بخاری رقم ۲۳۲۰، مسند احمد ۱۳۵۵۵، معجم کبیر طبرانی ۲۳۴۰۰،
الترغیب والترہیب ۳: ۲۴۲

ان احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان اگر کوئی درخت لگائے تو جو جاندار بھی اس کا پھل کھائے گا وہ درخت لگانے والے کا صدقہ ہوگا۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ثواب کا مدار تو نیت پر ہے۔ جب درخت لگانے والے نے اس صدقہ کی نیت ہی نہیں کی تو اس کو اس کا اجر و ثواب ملے گا؟ بعض علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اعمال اختیاریہ کے ثواب کا مدار نیت پر ہے اور اگر کوئی شخص دوسرے فعل کا اتفاقاً سبب بن جائے جس میں اس کے قصد و ارادہ کا دخل نہ ہو تو اس پر بغیر نیت کے بھی اجر مل جاتا ہے۔

علامہ بدر الدین عینیؒ نے اس حدیث کے بارہ میں مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اور اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ درخت لگانے والے کو اس پر
اجر و ثواب ملتا ہے خواہ اس نے اس ثواب کا ارادہ بھی نہ کیا ہو حتیٰ کہ
اگر اس نے درخت لگایا اور پھر اسے فروخت کر دیا اور کاشت کی اور
اس کو فروخت کر دیا تب بھی یہ اس کے حق میں صدقہ ہو جائے گا اس

لیے ان کا یہ عمل مخلوق خدا کی روزی میں اضافہ کا باعث ہوا۔"

(عمدۃ القاری، ۵/۱۵۲)

امام سرخسی نے مبسوط میں لکھا ہے کہ تقرب الی اللہ کے علاوہ اس امر کا کار خیر ہونا مسلم اور غیر مسلم دونوں کے حق میں یکساں ہے جیسا کہ سرکار دو عالم ﷺ کے اس اثر سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں۔

﴿عمروا بلادی فعاش فیہا عبادی﴾ (المبسوط ۲۳/۲۶)

"میری بستیوں کو آباد کرو تاکہ ان میں میرے بندے زندگی گزار سکیں۔"

اسی بارہ میں امام سرخسی فرماتے ہیں:

﴿فلہذا قلنا ہذا الفعل حسن من کل احد﴾ (المبسوط ۲۳/۲۶)

"پس اس وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ یہ عمل (یعنی زراعت) ہر کسی کے ہاتھوں بہتر عمل ہے۔"

امام سرخسی ہی کا بیان ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے مقام "جرف" میں زراعت اور کاشتکاری کی ہے (المبسوط ۲۳/۲۲) اور تجارت کرنا تو آپ ﷺ کا بہت سی احادیث میں آیا ہے۔ اس وجہ سے معلوم ہوا کہ جس طرح تجارت کرنا سنت ہے ایسے ہی زراعت اور کاشتکاری بھی سنت نبوی ہے۔ صرف اختلاف اس میں ہے کہ تجارت کرنا افضل ہے یا زراعت کرنا۔ بعض علماء کے نزدیک کاشت کاری کرنا افضل ہے بعض نے کہا کہ ہاتھ کی محنت پر مشتمل کام سب سے افضل ہے۔ بعض نے کہا کہ تجارت سب سے افضل ہے۔ حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ سے پوچھا گیا: "کون سا پیشہ اور کسب سب سے افضل ہے؟" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو کام انسان اپنے ہاتھ سے کرے اور ہر جائز بیع" درحقیقت ان سب میں اضافی فضیلت ہے بعض اعتبار سے کاشت کاری افضل ہے اور بعض اعتبار سے تجارت افضل ہے اور بعض اعتبار سے اجارہ اور صنعت و حرفت افضل ہے۔ امام سرخسی اس بارہ میں تحریر فرماتے

ہیں کہ بعض مشائخ حنفیہ کا قول ہے کہ تجارت اور صنعت و حرفت سے زراعت اور کاشتکاری افضل ہے۔ وجہ اس کی یہ بتائی کہ اس کا نفع عام ہے اور اس کی خیر کثیر ہے اور سرکار دو عالم ﷺ کے ارشاد اور عمل میں ان ریک خیال لوگوں کا رد ہے جو کاشتکاری اور فن کھیتی کو برا سمجھتے ہیں۔ (... ج ۱۳ ص ۱۳)

علامہ بدرالدین عینی نے بخاری کی شرح میں وہی بات لکھی ہے جو ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "ان تینوں وسائل معیشت کی افضلیت اور اہمیت دراصل ذاتی نہیں ہے بلکہ اضافی ہے۔ وہ اس لیے کہ یہ مخلوق خدا کی فلاح و بہبود اور عام خوشحالی اور رفاہیت کا ذریعہ ہیں لہٰذا جن ممالک میں غذائی اجناس کی قلت ہو اور وہاں کے حالات یا ماحول میں زراعت کی زیادہ ضرورت ہو تو وہاں زراعت افضل ہے تاکہ لوگوں کو اس سے نفع عام ہو لیکن اگر کسی جگہ زراعت کے وسائل مفقود ہوں تو وہاں تجارت کو افضلیت اور برتری حاصل ہوگی اور اگر کسی ملک کے باشندوں کو قدرتی اور طبعی طور پر زراعت اور تجارت کے مقابلہ میں صنعت کی زیادہ ضرورت ہو تو وہاں صنعت و حرفت کو فوقیت ہوگی اور یہی بات اور فیصلہ بہتر اور خوب ہے۔" (عمدۃ القاری ...)

معلوم ہوا کہ ہر سہ وسائل کے باہم راجح اور مرجوح ہونے کا سوال ملکوں کی طبعی حالت اور زندگی کی ضرورت اضافیات کے پیش نظر ہے نہ کہ کسی ذاتی فضیلت کے پیش نظر ان کی یہ افضلیت اضافی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ان تینوں وسائل کی جانب ملکی باشندوں کو یکساں توجہ دینی چاہیے کیونکہ یہ تینوں وسائل ہی ملکی ضرورت کیلئے لازمی ہیں۔ ان میں سے جس وسیلہ کی بھی کمی ہوگی ملک کا نقصان ہوگا۔ ملک کی تمدنی حالت اسی صورت میں درست اور مضبوط ہو سکتی ہے جب تینوں وسائل بقدر ضرورت ملک میں موجود ہوں ورنہ ملک کی بربادی یقینی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خام اجناس اور زرعی پیداوار کے بغیر نہ تجارت کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے اور نہ صنعت و حرفت ترقی کر سکتی ہے۔ زراعت کی کمی و خوبی تمدنی زندگی کو نہ صرف فاسد بلکہ تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ جب قومیں معاشی وسائل کو چھوڑ کر عیش پرستانہ وسائل زندگی اختیار

سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور تقسیم دولت مزید خراب ہوئی۔"

اسلام میں معاشی ترقی کا تصور

اسلام ایک مستقل دین اور مکمل نظام حیات ہے جو انسان کو ایک ایسا ضابطہ حیات عطا کرتا ہے جس کی روشنی میں آپ قوم یا ایک فرد روحانی اور مادی ترقی کی منازل نہایت آسانی کے ساتھ طے کر سکتا ہے۔ دیگر مذاہب جمود کے قائل ہیں لیکن ان کے برعکس اسلام جمود (Static) کا قائل نہیں بلکہ اسلام ایک متحرک (Dynamic) دین ہے جو کہ ہر قسم کے پیش آمدہ حالات اور ہر قسم کے معاملات پر غور وفکر کرنے اور وقت کے تقاضوں کو مد نظر رکھ کر قرآن وسنت کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں نیا لائحہ عمل مرتب کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اسی کو شریعت کی اصطلاح میں اجتہاد کہتے ہیں جس کے ذریعے ہر زمانے میں مسلمان اپنے لیے راہ عمل مرتب کر سکتے ہیں۔

اسلام کا مقصد انسان کی فلاح ہے۔ فلاح کا یہ تصور صرف اس دنیا کی زندگی بلکہ اخروی زندگی پر بھی محیط ہے اور یہ اصل زندگی تو اخروی زندگی ہے۔ دنیوی زندگی تو پچاس ساٹھ سال ہوگی لیکن اخروی زندگی تو ہمیشہ کی زندگی ہے اور نہ ختم ہونے والی زندگی ہے اور ایک مسلمان کیلئے دنیا اور آخرت دونوں کی زندگی بہتر ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم میں مومنین کو دعا سکھلائی گئی۔

﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (بقرہ: ۲۰۱)

"اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں اچھائی عطا فرما اور آخرت میں (بھی) اچھائی عطا فرما اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔"

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ دنیا کی بھلائی سے مراد ہے عافیت، نیک بیوی، علم، عبادت، پاکیزہ اعمال، نیک اولاد، صحت، دشمنوں پر فتح، نیک لوگوں کی رفاقت، اسلام پر ثابت قدمی اور ایمان پر خاتمہ اور آخرت کی بھلائی سے مراد جنت، بے حساب اور محشر کے

خوف سے معاشی خوشحالی اور بے روزگاری کی شدت ہے۔

پس آخرت کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی بھلائیوں اور ترقیوں کا حصول بھی ایک فرد اور بحیثیت مجموعی پورے معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔

انسانی زندگی میں فقر ان دونوں معاشی ترقی کے ساتھ مخصوص اور وابستہ ہے اس لئے اسلام نے اپنے ماننے والوں کو معاشی جدوجہد میں حصہ لینے، غربت اور جہالت کو ختم کرنے اور معاشی ترقی کے دیگر عوامل کی تحقیق و افزائش میں بھرپور ترغیب دیتا ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

﴿كاد الفقر ان يكون كفراً﴾

(كنز العمال ج [illegible] مؤسسة الرسالة، [illegible])

"فقر (غربت) انسان کو کفر کے قریب پہنچا دیتی ہے۔"

چنانچہ غربت کی وجہ سے بعض اوقات انسان دینی و جسمانی کمزور ہو جاتا ہے اور اپنی ایمانی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے سرکار دو عالم ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے

"اے اللہ میں فقر اور کفر دونوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔"

(سنن نسائی ج ۲ [illegible])

یہ حقیقت انسان کو سستی اور کاہلی اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے بچاتا ہے کیونکہ فقر و فاقہ سے بچنے کیلئے ایک طرف تو انسان معاشی جدوجہد کرے گا اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ سے فقر کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا کرے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث میں بھیک اور دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے منع کیا گیا ہے اور اپنی محنت سے روزی کمانے کا حکم دیا گیا ہے۔

دنیا میں موجود سرمایہ دارانہ معیشت و اشتراکیت کے مقابلہ میں اسلام کے پیش نظر صرف اور صرف مادی ترقی یا معاشی ترقی کا حصول نہیں بلکہ معاشی ترقی کو چند حدود کا پابند کیا گیا ہے۔ اسلام معاشی ترقی کا خواہاں ہے لیکن اس مقصد کے حصول کیلئے معاشرتی،

ترقی اور دینی اقدار کی قربانی سے کیسے ہی نہیں ہو جاتا ہے کہ جو بھی ترقی ہو وہ ان اقدار کو پیش نظر رکھ کر ہو، اور معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور دینی اقدار میں بھی ترقی ہو، اخلاقی اقدار کو پروان چڑھایا جائے۔ معاشرے کے تمام ادارے مثلاً تعلیمی ادارے، حکومت، بازار، مسجد، مدرسہ، درسگاہ اور اسکول وکالج وغیرہ اپنا بھرپور کردار ادا کریں تاکہ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشرے کا ہر فرد دینی اور روحانی ترقی کی منازل بھی طے کرتا رہے اور تقویٰ اور پاکیزگی کے لحاظ سے بھی وہ افراد میں ممتاز ہو۔ اس ترقی کا نظریہ بھی معیار اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی اس آیت میں بیان کرنے کی ہدایت کی ہے۔

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾

"تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے۔"

نفع کیلئے تجارت کرنے کا حق

اسلام میں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مال اور املاک کو جائز نفع کمانے اور اس طرح اپنی ملکیت اور مال میں اضافہ کرنے کیلئے استعمال کرے، وہ اپنے مال سے خود تجارت کر سکتا ہے اور دوسرے کاروباری شخص کے واسطے سے بھی اپنا کاروبار کر سکتا ہے۔

اسلام نے اس حق کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے اور اس کے فضائل اور برکات بھی احادیث میں ذکر کیے گئے ہیں چنانچہ قرآن حکیم میں ہے

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ﴾ (جمعہ: ۱۰)

"پس جب تمہاری نماز کی ادائیگی ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل (مال تجارت و رزق) کو تلاش کرو یعنی حاصل کرو۔"

اس آیت میں طلب رزق اور تجارت کو اللہ کے فضل سے تعبیر کیا گیا ہے، روایت کا شان نزول ترغیب تجارت پر ہی ہے۔

اسی وجہ سے اسلام نے کام کرنے پر زور دیا اور کسب رزق میں سب سے اچھا ذریعہ تجارت کو قرار دیا۔ سرمایہ یا مال اور بنیادی تجارتی، صنعتی یا زرعی کاروبار میں لگانے کے سوا اپنی منقولہ یا غیر منقولہ املاک کو کرایہ پر دینا بھی نفع آور کاروبار کی ایک جائز شکل قرار دیا گیا ہے۔

تجارت سے نفع کمانے کا ذریعہ بنیادی طور پر نقد سرمایہ ہوتا ہے۔ تاریخی طور پر نقد سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگانے کی چار شکلیں پائی جاتی رہی ہیں۔

(۱) اپنے سرمایہ سے خود تجارت کرنا اور اس سے ہونے والے نفع کو اپنا سمجھنا۔

(۲) کسی شخص کی تجارت یا کاروبار میں سرمایہ کے ساتھ شریک ہو جانا اور طے شدہ حد نفع کے مطابق حصہ وصول کرتے جانا۔

(۳) خود کاروباری عمل اور تجارت میں حصہ نہ لینا بلکہ سرمایہ کو اس شرط پر کسی تاجر یا کاروباری کے سپرد کر دینا کہ وہ نفع کا ایک حصہ مالک کو دے۔

(۴) سرمایہ کو متعین شرح پر سود پر قرض دینا۔

سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگانے کی بعض جدید شکلیں اور بھی ہیں جیسے کمپنیوں کے حصے خریدنا، سرکاری بانڈز (Bonds)، تمسکات (Securities) اور سیونگ سرٹیفکیٹ (Saving certificates) خریدنا بھی ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض شرعی طور پر سود کی وجہ سے ناجائز ہیں۔

پہلی شکل کو ذاتی کاروبار کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ نفع کمانے اور تجارت کرنے کی ابتدائی اور فطری شکل ہے اور عام طور پر لوگ تجارت کے اس طریقے کو درست اور صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ یہ نفع مالک کا اپنا کمایا ہوا نفع ہے۔

تجارت شروع کرنے سے پہلے ہر تاجر کو چند بنیادی اہمیت رکھنے والے فیصلے کرنے ضروری ہیں۔

(۱) وہ اپنا سرمایہ کس تجارت میں لگائے؟

(۲) کس چیز کی تجارت کرے؟

ہوئے تھے۔ اب ہر شخص کو اس کشتی کے نتیجے کا انتظار تھا۔ گزشتہ مقابلوں میں عمر بن خطاب کو کشتی دنگل کا منتظمین دیکھتے رہے تھے۔ جب سے یہ عدوی نوجوان آیا تھا یہ بھی اپنے حریفوں کو زیر کر پچھاڑ رہا تھا۔ اس وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال آنے لگا تھا کہ شاید وہ عمر بن خطاب کو بھی پچھاڑ دے۔ مقابلہ کا سخت دار تھا اس وجہ سے دونوں طرف سے شرطیں بھی بندھی ہوئی تھیں۔

شروع میں تو عمر بن خطاب نے اپنے حریف کو زور آزمائی کا پورا موقع دیا اور خود وہ اس کے داؤ پیچ سے اپنا بچاؤ ہی کرتے رہے لیکن جب تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ اس عدوی نوجوان کا سانس پھول گیا ہے تو آپ ایک دم شاہین کی طرح جھپٹ کر اس کے کندھوں پر سوار ہو گئے اور پھر بہت پھرتی سے اسے زمین پر پہلوؤں کے بل گرا دیا۔ اس عدوی نوجوان کا زمین پر گرنا تھا کہ چاروں طرف سے تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسنے لگے اور پوری فضا مرحبا کے نعروں سے گونج اٹھی اور ہر دیکھنے والا مرد اور عورت حتی کہ نوجوان لڑکیاں بھی اس عجیب الخلقت قریشی نوجوان عمر بن خطاب کی تعریف و توصیف کرنے لگیں اور فن پہلوانی کے اس کے گزشتہ کمالات بھی دہرائے جانے لگے۔ (کتاب الذہب ۲، ۱۳۵)

سیدنا عمر بن خطاب کا یہ واقعہ ہم نے اس لئے نقل کیا ہے تا کہ پتہ چل جائے کہ سوق عکاظ میں صرف تجارت ہی نہ ہوتی تھی بلکہ فن پہلوانی کے کرتب بھی دکھائے جاتے تھے۔ عکاظ کے اس میلہ میں جتنے بھی منعقد ہوتے تھے ان میں ہر قبیلہ والے اپنے شعراء پیش کرتے اور یہ شعراء اپنے اشعار میں اپنی بڑائی اور اپنے آباؤ اجداد کے مناقب و مفاخر بیان کرتے تھے۔ پھر ان اشعار پر تنقید و تحسین و داد کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ کسی قبیلہ کے مفاخر اور مناقب کے الفاظ جتنے سب سے مؤثر اور بڑا اثر رکھنے والے سمجھے جاتے۔ گویا یہ اس زمانہ کا ایک میڈیا تھا۔ اس لئے ہر قبیلہ اپنے شاعر کی بادشاہ کی طرح تعظیم کرتا تھا گویا اس زمانے میں شاعر بے تاج بادشاہ ہوتا تھا۔

سبع معلقات مشہور قصیدے بھی سوق عکاظ میں شعری فصاحت و بلاغت کی وجہ سے عکاظ کے ایک خاص حصے میں لٹکائے گئے تھے۔ بازار عکاظ کا آغاز ہوتے ہی

ہوتا تھا کیوں کہ بازار کے اندر چوروں اور ڈاکوؤں کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ ان ضامن قبیلہ کے رئیس کے کارندے بازار کے اندر دار و گیر و حفاظت پر مامور ہوتے تھے۔ تمام بازاروں اور دور دراز علاقوں پر سے گزرنے کے لیے خفارہ کے بغیر پہنچنا مشکل تھا۔ اس لیے راستے میں واقع قبائل کی حفاظت اور امداد سے یہ کام آسان ہو سکتا تھا۔

یعقوبی نے لکھا ہے کہ عرب کے مشہور بازار دس ہیں۔ ان بازاروں میں لوگ تجارت اور خرید و فروخت کے لیے جمع ہوتے تھے اور ان کے اموال اور جانوں کی پوری پوری حفاظت کی جاتی تھی۔ [یعقوبی: ۱/۲۳۰]

ان اسواق کے احوال کے لیے ملاحظہ ہو [ابن حبیب: المحبر ۲۶۳-۲۶۸، کتاب الازمنہ والامکنہ، مرزوقی ۲/۱۶۱ [illegible] کتاب الاغانی [illegible] ۱۱، ۱۶، ۹۴، ۸۴ [illegible]]

ان بازاروں کی حفاظت کرنے والے محرمون، اور ان میں فساد اور لوٹ مار کرنے والے محلون کہلاتے تھے۔ محرمون میں بنی قلب، اسد، بنی عمرو بن تمیم، بنی حنظلہ بن زید اور ہذیل اور بنی شیبان کے لوگ لوگوں کو لوٹ مار اور ظلم و تشدد سے روکنے کے لیے ہر وقت مسلح رہتے۔ جو محلون میں تھے وہ اسد، طے، بنی بکر اور بنی عامر بن صعصعہ کے کچھ لوگ محلون تھے۔ [یعقوبی: ۱/۳۰ [illegible]]

عرب کے مشہور بازاروں کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) سوق دومۃ الجندل (۲) سوق ہجر (۳) سوق عمان (۴) سوق المشقر (۵) سوق عدن ابین (۶) سوق صنعا (۷) سوق حضرموت (۸) سوق ذو المجاز (۹) سوق [illegible] (۱۰) سوق عکاظ (۱۱) سوق حباشہ (۱۲) سوق [illegible] (۱۳) سوق بدر (۱۴) سوق بنی قینقاع (۱۵) سوق الشحر (۱۶) سوق [illegible]

یہ تو عام بازار تھے۔ ان کے علاوہ بعض چھوٹے بازار بھی تھے جو کسی خاص قبیلہ سے متعلق ہوتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلا بازار جو منعقد ہوا وہ دومۃ الجندل تھا۔ [مرزوقی: الازمنہ والامکنہ ۲/۱۶۱، تاریخ [illegible]]

جاتا ہے اور تجارتی نقطہ نظر سے بھی ایک نہایت قبیح حرکت ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو وہاں کے لوگ ناپ تول میں بہت برے تھے۔ اس وقت "ویل للمطففین" یعنی جہنم ہے کم ناپنے اور کم تولنے والے لوگوں کے لیے۔ اس کے نزول کے بعد لوگوں نے ٹھیک اور درست ناپ تول شروع کر دیا۔

[جامع البیان طبری ۳۰/۹۱، مستدرک ۲/۳۳، معجم کبیر طبرانی ۱۱/۱۱]

اور ترمذی کی ایک روایت میں سرکار دو عالم ﷺ نے ناپ تول کرنے والوں کو فرمایا: "تم لوگ ایسا کام کرنے لگے ہو جس میں تم سے پہلے بہت امتیں ہلاک ہو چکی ہیں۔" مطلب یہ کہ اگر تم بھی ناپ تول میں کمی کرو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے۔

(۸) ایک تاجر کو خرید و فروخت کرتے وقت ہمیشہ سچ بولنا چاہیے۔ کذب بیانی تجارت کے لیے نہایت نقصان دہ ہے۔ اور پھر جو شخص تجارت میں جھوٹ بولتا ہے، حدیث میں اس کو فاجر کہا گیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ عید گاہ کی طرف تشریف لے گئے جہاں بازار تھا۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ خرید و فروخت میں مصروف ہیں۔ آپ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا: "اے تاجروں کے گروہ!" انہوں نے سرکار دو عالم ﷺ کی پکار کا جواب دیا اور گردنیں اور نظریں آپ کی طرف اٹھائیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا

﴿ان التجار یبعثون یوم القیامة فجاراً الا من اتقی و برّ و صدق﴾

"تاجر لوگ قیامت کے روز بہت گناہگار (فاجر) اٹھائے جائیں گے سوائے ان کے جو پرہیزگار رہے اور انہوں نے نیکی اختیار کی اور سچ کو اپنایا۔"

[ابن ماجہ رقم ۲۱۴۶، ترمذی، سنن کبریٰ بیہقی ۵/۲۶۶، ابن حبان ۱۱/۲۷۶، مصنف عبدالرزاق ۸/۱۲۵۹۵، مستدرک حاکم ۲/۶، مسند الدارمی ۲/۲۴۷، معجم کبیر طبرانی ۵/۲۶۶، حلیۃ الاولیاء ۱۰/۱۱]

(۹) تاجروں کو خرید و فروخت کرتے وقت قسمیں کھانے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اگر قسم جھوٹی ہوئی تو یہ حرام ہے اور اگر سچی ہوئی تو تاجر کو قسم کھانے کی عادت پڑ جائے گی اور پھر جھوٹی قسم بھی کھانے لگے گا۔ چنانچہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا:

﴿إياكم والحلف في البيع، فإنه ينفق ثم يمحق﴾

(ابن ماجہ رقم ۲۲۰۹)

"مال کی خرید و فروخت میں قسم کھانے سے بچو، کیوں کہ قسم کھانے سے مال تو بک جاتا ہے لیکن برکت ختم ہو جاتی ہے۔"

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین آدمی ایسے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ قیامت کے روز ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ بوڑھا زانی، متکبر فقیر اور تیسرا وہ تاجر جو مال خریدتے وقت بھی قسمیں کھاتا ہے اور فروخت کرتے وقت بھی قسمیں کھاتا ہے۔ (مجمع الزوائد ۷۸/۴ بحوالہ معجم کبیر طبرانی رقم ۶۱۱۱)

(۱۰) تجارت سے بہت سے گناہ معاف ہوتے ہیں چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿إن من الذنوب ذنوباً لا تكفرها الصلاة، ولا الصيام، ولا الحج، ولا العمرة. قالوا: فما يكفرها يا رسول الله؟ قال: الهموم في طلب المعيشة﴾

"بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ نہ تو نماز ہے اور نہ روزہ، نہ حج ہے اور نہ عمرہ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا "یا رسول اللہ! پھر ان کا کفارہ کیا ہے؟" آپ نے فرمایا: "طلب معاش کی فکر اور غم"۔

(مجمع الزوائد ۶۴/۴ بحوالہ معجم اوسط طبرانی رقم ۱۰۲)

معیشت کی طلب میں جس قدر فکر و غم تجارت میں ہوتا ہے اتنا فکر و غم ملازمت میں ہوتا ہے اور نہ زراعت اور صنعت و حرفت میں، خصوصی طور پر اس زمانے میں کہ ہر شخص کو مال و دولت کی فکر لاحق ہے کیوں کہ موجودہ زمانے میں مال و دولت کے بغیر کسی شخص کی

معاشرہ میں نہ عزت و وقار اور نہ ہی اس کی کہیں شنوائی ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا:

﴿لیاتین علی الناس زمان، لاینفع فیہ الا الدینار والدرھم﴾

"یقیناً لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں درہم و دینار (یعنی مال و دولت) کے سوا سے اور کوئی چیز فائدہ نہ دے گی۔"

[مجمع الزوائد بحوالہ مسند احمد ۱۳۳/۴، معجم کبیر ۲۷۹/۲۰]

بیع کی تعریف

قبل اس کے کہ ہم بیع اور خرید و فروخت پر کچھ مزید بحث کریں اور اس کی باطل اور فاسد صورتوں کو بیان کریں، یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ بیع کے لغوی اور شرعی معنی کیا ہیں؟ اس بارہ میں علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ قیمت والی شئی کو دے کر اس کی قیمت لے لینا بیع اور خریدنے اور فروخت کرنے دونوں پر بیع کا اطلاق ہوتا ہے، گویا بیع الفاظ اضداد میں سے ہے۔ اس بارہ میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

﴿لایبیع احدکم علیٰ بیع اخیہ﴾

"کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع کو نہ خریدے۔"

یہاں خریدنے پر بیع کا اطلاق کیا گیا ہے۔ (المفردات ص ۶۷)

علامہ ابن نجیم مصباح کے حوالے سے بیع کا لغوی معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ایک چیز کے بدلہ میں دوسری چیز دینا ہے اس سے قطع نظر کہ وہ مال ہو یا مال نہ ہو، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے۔

﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ﴾ [یوسف: ۲۰]

یعنی انہوں نے اس کو (سیدنا یوسف علیہ السلام کو) معدودے چند درہموں کے عوض

فروخت کر دیا تھا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام آزاد شخص تھے "مال" نہ تھے۔ بہر حال لغت میں بیع کا اطلاق خریدنے اور بیچنے دونوں پر ہوتا ہے لیکن بائع کا اطلاق بیچنے والے پر ہے۔"

[البحر الرائق: ۵/۲۷۶]

بیع کے شرعی معنی کے بارے میں ابن نجیم لکھتے ہیں کہ صاحب کنز الدقائق علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ

ھو البیع تبادلة المال بالمال بالتراضی

"شرعی طور پر آپس کی رضا مندی کے ساتھ مال کے بدلے میں مال دینے کو بیع کہتے ہیں۔ اور اللغت الفقہیہ میں لکھا ہے کہ جس شئے کی طرف طبیعت مائل ہو اور اس کو ضرورت کے وقت ذخیرہ کیا جا سکے اس کو مال کہتے ہیں۔ کسی شئی کا مال ہونا اس وقت ثابت ہوتا ہے جب عرف میں اس کی کوئی قیمت ہو ورنہ اس چیز سے بلا قیمت کے نفع حاصل کرنا مباح ہو (جیسے گندم کا ایک دانہ) وہ مال نہیں ہے۔ علامہ کاسانی کی بدائع الصنائع میں ہے کہ کسی مرغوب شئی کا دوسری مرغوب شئی سے تبادلہ اگر قولاً ہو تو ایجاب و قبول بیع ہے اور اگر فعلاً ہو تو بیع تعاطی ہے۔"

[البحر الرائق شرح کنز الدقائق: ۵/۲۷۵]

خرید و فروخت کی چند ناجائز صورتیں

رسول اللہ ﷺ نے چند قسم کی خرید و فروخت اور بیع کو ناجائز قرار دیا اور مسلمانوں کو ان کی بیع کرنے سے منع فرمایا۔

(۱) بیع ملامسہ اور منابذہ

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے بیع ملامسہ اور بیع منابذہ سے منع فرمایا ہے۔ [مسلم رقم ۳۸۰۵، بخاری رقم ۲۱۴۶، نسائی رقم ۴۵۱۴، تحفۃ الاشراف رقم ۱۳۸۲۴، ۱۳۸۲۴، نسائی ۴۵۲۹، بخاری ۲۱۴۴، ابن ماجہ رقم ۲۱۶۹]

ملامسہ کیا ہے؟ اس کی تعریف امام نووی نے یہ فرمائی ہے کہ کوئی شخص کسی تاریکی اور اندھیرے میں ایک کپڑا اٹھائے یا لپٹا ہوا کپڑا ہے اور خریدار سے یہ کہے کہ میں یہ کپڑا تم کو اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ جب تم اس کو ہاتھ لگا دو گے تو تمہارا اس کو چھونا اس کو دیکھنے کے قائم مقام ہوگا اور بعد میں تمہیں اس کو واپس کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔

اس کی دوسری تعریف یہ ہے کہ صرف چھونے سے بیع لازم ہو جائے۔ فروخت کرنے والا مشتری سے کہے جب تم نے اس کو چھو لیا تو بیع واجب ہو جائے گی۔

[نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۹۳۔۲۹۴]

احناف کے نزدیک بیع ملامسہ کی تعریف یہ ہے کہ فروخت کرنے والا کہے کہ میں تم کو یہ چیز اتنی رقم کے عوض فروخت کرتا ہوں۔ جب تم اس چیز کو چھو لو گے تو بیع واجب ہو جائے گی۔ یا مشتری اس طرح کہے۔ [عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۲۶۶]

اور منابذہ کی تعریف یہ ہے کہ بائع اور مشتری کسی چیز کی قیمت پر راضی ہو جائیں یا بائع یہ کہے کہ جب میں یہ چیز تمہاری طرف پھینک دوں گا تو بیع لازم ہو جائے گی اور تمہیں اس کو واپس کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔ [فتح الباری ج ۴ ص ۳۵۹]

ان دونوں قسم کی خرید و فروخت کے ناجائز ہونے کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ غائب چیز کی بیع جائز ہے اور اس میں مشتری کو دیکھنے کے بعد اس کو مسترد کرنے کا اختیار ہے خواہ وہ بیان کردہ اوصاف کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس کے باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب مشتری سودے کو نہیں دیکھے گا تو اس بیع میں دھوکا ہوگا اور یہ قمار یعنی جوئے کے مترادف ہے۔

[عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۲۶۷، فتح الباری ج ۴ ص ۳۵۹]

(۲) کنکری پھینکنے والی اور دھوکہ کی بیع

زمانہ جاہلیت میں خرید و فروخت کا ایک طریقہ یہ تھا کہ بائع کے پاس مثلاً کپڑوں کا ایک ڈھیر ہے اور بائع اور مشتری جب قیمت پر متفق ہو جاتے تو مشتری جس کپڑے پر

"تم میں سے کوئی شخص دوسرے کی بیع پر بیع نہ کرے"

[بخاری رقم ۲۱۳۹، ۲۱۶۵، مسلم رقم ۳۷۷۰، ۳۷۷۲، ۳۷۹۰، ۳۸۹۹، ابو داود رقم ۳۴۳۶، ترمذی رقم ۱۲۹۲، نسائی رقم ۴۵۰۸، ۴۵۰۵، ابن ماجہ رقم ۲۱۷۱، ابن حبان ۱۱/۳۰۷، سنن کبری بیہقی ۵/۳۴۷، معرفة السنن والآثار بیہقی ۸/۳۳۴۸، سنن دارمی ۲/۲۵۵، شرح السنة بغوی ۸/۱۱۵، کتاب الام شافعی ۳/۱۸، مسند حمیدی ۲/۲۵۰، مسند ابی یعلیٰ ۱۰/۲۰۷، حلیة الاولیاء ابی نعیم ۹/۲۲۵، اتحاف السادة المتقین ص ۳۹]

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لا یبیع الرجل علیٰ بیع اخیه، ولا یخطب علیٰ خطبة اخیه، الا ان یاذن له﴾

"کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے اور نہ کوئی اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی کرے مگر یہ کہ وہ اجازت دے دے (بعض روایات میں اجازت کی قید نہیں ہے)۔" [مقدمہ عمدہ صحیح نمبر ۳۳۳۰]

[بخاری رقم ۲۱۳۹، ۲۱۶۵، ۵۱۴۲، ۳۸۹۹، مسلم رقم ۳۴۴۹، ترمذی رقم ۱۲۹۲، نسائی رقم ۴۵۰۸، ۴۵۰۵، ابن ماجہ ۲۱۷۱، مختصر نسائی، سنن کبری ۳/۱۰۲، مصنف ابن ابی شیبہ ۳/۳۰۸، سنن کبری بیہقی ۵/۳۴۶، معرفة السنن والآثار بیہقی ۸/۳۳۴۶، مصنف عبدالرزاق ۸/۱۹۸، شرح السنة بغوی ۸/۱۱۷، مسند احمد ۲/۷، مسند حمیدی ۲/۲۳۵، طحاوی ۴/۳]

ایک اور روایت میں جو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لا یسم المسلم علیٰ سوم المسلم﴾

"کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے نرخ کرتے وقت نرخ نہ کرے۔"

[مسلم رقم ۳۷۷۲، ترمذی رقم ۱۲۹۲، نسائی رقم ۴۵۰۹، ۴۵۱۰، سنن کبری بیہقی ۵/۳۴۷]

کتاب الاعلام فی ۳/۲۰۷]

بیع پر بیع کرنے کی جو ممانعت حدیث میں آئی ہے کہ کسی شخص نے مدت خیار میں کوئی چیز خریدی۔ اب اس سے کوئی شخص کہے کہ اس بیع کو فسخ کر دو میں تم کو یہ چیز کم دام اور قیمت پر فروخت کروں گا، یہ ناجائز ہے۔ یا خریدار کہے کہ تم اس بیع کو فسخ کر دو میں اس شے کی تم کو اس سے زیادہ قیمت دوں گا۔ یہ بھی ناجائز صورت ہے۔

اور نرخ پر نرخ کی ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ خریدار اور فروخت کنندہ دونوں کسی شے کی بیع پر راضی ہوں لیکن ابھی عقد بیع نہ ہوا ہو کہ ایک شخص بائع سے کہے میں زیادہ قیمت دوں گا قیمت ہو جانے کے بعد یہ بھی ناجائز ہے۔ البتہ نیلام میں زیادہ بولی دینا جائز ہے، کیوں یہ حدیث سے ثابت ہے۔ [رواہ الترمذی]

(۴) بیع نجش کی ممانعت:

رسول اللہ ﷺ نے بیع نجش کی ممانعت فرما دی ہے۔ بیع نجش کیا ہوتی اس بارہ میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

﴿نهى عن النجش﴾

"آپ ﷺ نے نجش سے منع فرمایا۔"

[مسلم رقم ۱۵۱۶، بخاری رقم ۲۱۴۲، ۶۹۶۳، نسائی رقم ۴۵۰۵، ابن ماجہ رقم ۲۱۷۳، سنن کبریٰ نسائی ۵۳/۴، سنن کبریٰ بیہقی ۳۴۳/۵، معرفۃ السنن والآثار ۳۸۳/۴، ابن حبان ۳۴۳/۱۱، شرح السنۃ بغوی ۱۲۱/۸، مسند احمد ۷/۲، مسند ابی یعلی ۵۸۰، الاعلام کتاب الام للشافعی ۹۹/۳]

نجش کے بارہ میں علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ جب کسی چیز کی اصل قیمت لگا دی جائے اس کے بعد اگر کوئی شخص اس کی قیمت بڑھائے حالانکہ اس کا خود خریدنے کا ارادہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد صرف دوسرے شخص کو ترغیب دینا ہے تو یہ "نجش" ہے اور شریعت اسلامیہ نے اسے ممنوع قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو روکا ہے۔ کیونکہ

اس کا مقصد ایک مسلمان کو دھوکہ دینا ہے لیکن اگر کسی چیز کی قیمت کم لگائی گئی ہو اور وہ خریدنے کا ارادہ کیے بغیر اصل قیمت لگوانے کے لیے اس کی قیمت بڑھائے تو یہ جائز ہے کیونکہ اس میں کسی دوسرے کو ضرر پہنچائے بغیر ایک مسلمان کو فائدہ اور نفع پہنچانا مقصود ہے۔ یہ اس وقت ہے جب دوسرا شخص اس چیز کو کم قیمت سے خریدنا چاہتا ہو۔ (فتح القدیر ۶/۲۰۴)

نجش کے ممنوع ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ آئمہ اربعہ کے نزدیک یہ حرام اور ناجائز ہے۔

نجش کے ناجائز ہونے کی وجہ سے بعض فقہاء نے نیلام کی بیع کو بھی مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ نیلام میں بھی لوگ خریداری کی بولی پر بڑھ چڑھ کر لگاتے ہیں۔ چنانچہ امام ابراہیم نخعی کے نزدیک بھی نیلام کی بیع مکروہ ہے لیکن جمہور فقہاء کے نزدیک یہ بیع مطلقاً جائز ہے۔ (فتح الباری ۴/۳۰۵)

جمہور فقہاء کی دلیل یہ ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک چادر اور ایک پیالہ فروخت کیا اور فرمایا: "اس چادر اور پیالے کو کون خریدے گا؟" ایک شخص نے کہا کہ میں ان کو ایک درہم میں خریدوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "ایک درہم سے زیادہ کون دے گا" ایک دوسرے شخص نے دو درہم کہا آپ نے وہ چادر اور پیالہ اس شخص کو دے دیے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

(ترمذی رقم ۱۲۱۸، ابوداؤد ۱۶۴۱، نسائی ۷/۲۵۹، مجمع الزوائد ۴/۸۵، ابن ماجہ رقم ۲۱۹۸، سنن کبریٰ بیہقی ۵/۳۴۸، شعب الایمان بیہقی ۳/۳۰۲، شرح السنہ بغوی ۸/۱۲۱، مسند احمد ۳/۱۰۰، مسند ابو داؤد الطیالسی ۲۱۴۵، حلیۃ الاولیاء ۳/۱۲۲)

(۵) تلقی جلب کی ممانعت:

رسول اللہ ﷺ نے تلقی جلب سے بھی منع فرمایا۔ تلقی جلب کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص شہر سے باہر نکل کر ان تاجروں کا استقبال کرے جو شہر میں مال فروخت کرنے کے لیے آتے ہیں اور وہ شخص ان اجناس اور مال لانے والوں کے شہر میں داخل ہونے اور شہر کا

نرخ معلوم ہونے سے قبل ان سے ان کا مال خرید لے۔ اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ تاجروں کو ضرر سے بچایا جائے کیونکہ جب وہ شہر کا بھاؤ معلوم ہونے سے قبل اپنا مال فروخت کریں گے تو بسا اوقات ان سے مال خریدنے والا شہر سے کم قیمت پر مال خرید لے گا۔ اس طرح وہ تاجر نفع سے محروم ہو جائیں گے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سودا فروخت کرنے والوں کی ملاقات سے منع فرمایا تاوقتیکہ وہ بازار تک آ جائیں۔

[مسلم رقم ۱۵۱۷، نسائی رقم ۴۵۰۱، بخاری رقم ۲۱۶۵، ۲۱۶۶، ترمذی رقم ۱۲۲۱، ابن ماجہ ۲۱۷۹، سنن کبریٰ بیہقی ۵/۳۴۸، معرفۃ السنن والآثار ۴/۳۵، سنن الدارمی ۲/۲۵۵، طحاوی ۲/۸، مسند احمد ۲/۷، ۶۳، مسند ابی یعلیٰ ۱۰/۵۹۲۵، معجم اوسط طبرانی ۲/۲۱۱، ابن حبان ۱۱/۴۹۶۴، مسند حمیدی ۲/۶۳۳]

امام محمد ابن سیرین فرماتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

> ”سودا بیچنے والوں سے آگے جا کر نہ ملو جس نے پہلے آگے جا کر سودا خرید لیا پھر سودے کا مالک (تاجر) بازار گیا اور اس کو بازار کا نرخ معلوم ہو گیا تو اس کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے۔“

[مسلم رقم ۱۵۱۹، نسائی ۴۵۰۱، تحفۃ الاشراف ۱۴۵۳۹]

(۶) شہری کو دیہاتی کا مال فروخت کرنا

رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کی بیع سے بھی منع فرمایا ہے۔ جس میں شہری دیہاتی کا مال فروخت کرے۔ [مجمع الزوائد ۴/۹۹، طبرانی کبیر رقم ۵۹۲۵]

چنانچہ امام نووی اور حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ شہری کی دیہاتی سے بیع حرام ہے اور وہ یہ ہے کہ دیہاتی اس وقت کے نرخ پر سودا فروخت کرنے کے لیے شہر میں لائے اور اس کے پاس شہری آ کر کہے کہ اپنا مال میرے پاس رکھو تاکہ میں تمہارے سامان کو موجودہ نرخ سے زیادہ قدرے مہنگا فروخت کر دوں۔ اس بیع کے ممنوع ہونے کی حسب ذیل

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ سیدنا مروان سے کہا کہ کیا تم نے سودی بیع کو حلال کر دیا ہے۔ مروان نے کہا: میں نے کیا کیا ہے؟ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم نے ہنڈی (Bill of Exchange) کی بیع کو جائز کر دیا ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبضہ سے قبل اناج کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ پھر مروان نے لوگوں کو خطبہ دیا اور لوگوں کو ہنڈی کی بیع سے منع کر دیا۔ سلیمان (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سپاہی لوگوں کے ہاتھوں سے ہنڈیاں چھین رہے تھے۔ [مسلم رقم ۱۵۲۸]

علماء نے قبضہ سے قبل چیز کی بیع کی ممانعت کی بڑی حکمتیں بیان کی ہیں جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

(۱) بیع قبل القبض میں دھوکہ کا امکان ہوتا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ مبیع (فروخت شدہ چیز) بائع کے پاس ہلاک ہو جائے۔

(۲) جب خریدار مبیع پر قبضہ کرے گا تو پھر اس میں بائع کے تصرف کرنے کا امکان ختم ہو جائے گا۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ فروخت کرنے کے بعد بائع زیادہ قیمت دینے والا کوئی اور گاہک دیکھ لے تو وہ خریدار کو مبیع پر قبضہ دینے سے انکار یا بیع فسخ کر دے۔

(۳) اس زمانہ میں بیع قبل القبض کی وجہ سے سٹے کو فروغ ملتا ہے اور اجناس اور دیگر اشیائے ضروریہ کی قیمت کی گرانی بڑھتی ہے جس سے صارفین کا استحصال ہوتا ہے۔

(۴) ہمارے ملک میں اسٹاک ایکسچینج (Stock Exchanges) میں روزانہ کروڑوں روپے کا سٹے کا کاروبار ہوتا ہے۔ سٹے میں چونکہ صرف کاغذات اور ٹیلی فون پر بیع ہوتی ہے اور عملی طور پر فروخت نہیں ہوتی اور نہ مبیع پر قبضہ کیا جاتا ہے اس لیے اس حدیث کی رو سے یہ کاروبار ناجائز ہے۔

(۵) بیع قبل القبض میں ایک شخص کسی سے کوئی شے دس روپے میں خریدتا ہے اور اس شے پر قبضہ کیے بغیر وہی شے چودہ روپے میں کسی اور شخص کو فروخت کر دیتا ہے جبکہ وہ شے ابھی بائع کے پاس ہے تو اس نے دس روپے کو چودہ روپوں میں

فروخت کر دیا اور یہی شے خلاف سود ہے۔

(٨) مجہول ڈھیر کی بیع ممنوع ہے

کھجور، گندم، جو یا کسی اور شے کا ڈھیر لگا ہوا ہو لیکن اس کی مقدار مجہول ہو یعنی یہ معلوم نہ ہو کہ کھجور اور گندم کتنے من ہے۔ شریعت میں اس کی بیع ممنوع اور ناجائز ہے۔ چنانچہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"کھجوروں کے جس ڈھیر کی مقدار پیمائش کے معروف طریقہ سے معلوم نہ ہو اس کو معین کھجوروں کے عوض فروخت کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔" [مسلم، بیوع، ۳۸۹۷، سنن نسائی رقم ۴۵۵۱]

اس مضمون کی اور احادیث بھی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

[السنن الکبریٰ ۵/۲۹۴، شرح السنۃ للبغوی ۸/۸۰، سنن کبریٰ بیہقی ۵/۳۱۴، معرفۃ السنن والآثار ۸/۳۴، مسند حمیدی ۲/۹۲۳، معجم کبیر طبرانی ۱۱/۲۲۴، ابی داؤد، مجمع ص ۳۲۰]

(٩) ظہور صلاحیت سے قبل درختوں پر پھلوں کی بیع:

اسلام میں ظہور صلاحیت سے پہلے درختوں پر پھلوں کی بیع سے منع فرمایا گیا۔ ظہور صلاحیت کا مطلب یہ ہے کہ پھل اس مقدار تک ہو جائیں کہ وہ قدرتی آفات سے محفوظ ہو جائیں۔ فقہائے شافعیہ کے نزدیک اس کا معنی پھلوں کا پک جانا اور اس میں مٹھاس کا آ جانا ہے۔ [فتح القدیر ۵/۱۰۲، ۴۸۹]

علامہ ابن ہمام اس بارہ میں مزید لکھتے ہیں کہ "پھلوں کے ظاہر ہونے کے بعد ان کی صلاحیت ظاہر ہونے سے قبل اگر یہ شرط لگائی جائے کہ پھلوں کو درختوں پر رہنے دیا جائے گا اور توڑا نہیں جائے گا تب بھی اس بیع کے عدم جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔

[فتح القدیر ۵/۴۸۹]

موجودہ دور میں اکثر اسلامی ملکوں میں باغات کے پھلوں کی بیع کا طریقہ یہ ہے کہ درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کی بیع کی جاتی ہے اور درختوں سے پھلوں کو توڑ کر بیع نہیں

باقی رہا مسئلہ دیر تک پھلوں کو درختوں کے ساتھ رکھنے کا تو فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ پھل خریدنے کے بعد ان کا درختوں سے اتارنا واجب ہے۔ اگر خریدار یہ شرط لگائے کہ وہ پکنے تک پھلوں کو برقرار رکھے گا تو یہ شرط باطل ہے کیونکہ یہ سودا ہے جس کی حدیث میں ممانعت ہے۔ یہ اس وجہ سے ممنوع ورنہ جائز ہے کہ بیع میں ایسی شرط لگائی گئی ہے جس کا عقد تقاضا نہیں کرتا اور رسول اللہ ﷺ نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے۔

اس اشکال کا حل یہ ہے کہ بیع بغیر شرط ترک کے کی جائے اور پھر اگر بائع پھلوں کو درخت پر رہنے دینے کی اجازت دے دے تو جائز ہے اور چونکہ عرف یہ ہے کہ بیع میں یہ شرط نہیں لگائی جاتی اور ایک مدت تک پھلوں کے درختوں پر برقرار رہنے پر بائع کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا اس لیے یہاں ضمناً بائع کی اجازت حاصل ہے۔

(۱۰) ہنڈی کی بیع

ہنڈی کی بیع بھی اسلام میں جائز نہیں ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ زید نے حبیب سے مال خریدا اور تین ماہ بعد رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کیلئے زید نے حبیب کو ایک دستاویز ہنڈی (Bill of Exchange) دی جس میں اس نے لکھ دیا کہ وہ تین ماہ بعد حبیب کو ایک ہزار روپیہ ادا کرنے کا پابند ہے۔ پھر حبیب یہ ہنڈی لے کر بینک گیا اور پانچ فیصد کمیشن پر نو سو پچاس روپے میں یہ ہنڈی کی دستاویز فروخت کر دی۔ پھر بینک مقررہ تاریخ پر حبیب سے ایک ہزار روپے وصول کر لیتا ہے۔ بینک کو اس کاروبار میں پچاس روپے کا فائدہ ہوا اور حبیب کو اپنی رقم جلد مل جاتی ہے۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ بینک وہ ہنڈی دوسرے بینک کو فروخت کر دیتا ہے۔

شرعی طور پر یہ بیع جائز نہیں۔ اس کے عدم جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس بیع میں غرر (دھوکہ) ہے کیونکہ اگر مشتری دیوالیہ ہو جائے تو بینک کی رقم ڈوب جائے گی۔ یا وہ اپنی تمام املاک فروخت کر کے بیرون ملک چلا جائے تو بینک کی رقم ہلاک ہو جائے گی۔ اس کے ناجائز ہونے کی دوسری وجہ علماء نے یہ بیان کی ہے کہ یہ تجارت ادھار کے ساتھ نقود کا تقرر

سے جواب ہے اور اس کی حرمت ربا الفضل میں منصوص ہے۔

(۱۱) مال کی فروخت و حصول نفع کا ایسا معاملہ جس میں باہمی تعاون مقصود نہ ہو، صرف ایک طرف کا فائدہ دوسری طرف کے یقینی نقصان پر مبنی ہو جیسے جوا، لاٹری اور سٹہ وغیرہ۔ اس میں متعاقدین میں سے ایک جانب کا فائدہ اور دوسری جانب کے مکمل نقصان کا باعث اور سبب ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے۔

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ بقرہ ۲۱۹

"یہ لوگ آپ سے شراب اور جوا کے بارے میں دریافت کرتے ہیں؟ آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں باتوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کیلئے کچھ فائدے بھی ہیں۔"

اس آیت میں جوئے کیلئے "میسر" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو یسر سے ماخوذ ہے جس کے معنی تقسیم کے ہیں۔ جوئے میں بھی مال حصہ داروں میں تقسیم ہوا کرتا ہے اس لئے اس کو "میسر" کہتے ہیں۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ عربی میں جوئے کے لئے میسر اور قمار کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ "میسر" کا لفظ یسر سے بنا ہے جس کے معنی آسانی کے ہیں چونکہ جوئے میں جیتنے والا آسانی سے رقم حاصل کر لیتا ہے اس لئے اس کو میسر کہتے ہیں۔

میر سید شریف قمار کی تعریف میں لکھتے ہیں

"ہر وہ کھیل جس میں یہ شرط ہو کہ مغلوب کی کوئی چیز غالب کو دی جائے گی قمار ہے۔" (التعریفات ص ۱۱۶)

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ قمار قمر سے ماخوذ ہے جو کبھی کم ہوتا ہے اور کبھی زیادہ اور جوئے کو قمار اس لئے کہتے ہیں کہ جوا کھیلنے والوں میں سے ہر ایک اپنا مال اپنے ساتھی کو دینے اور اپنے ساتھی کا مال لینے کو (شرط کے ساتھ) جائز سمجھتا ہے۔ اور یہ نص قرآنی سے حرام ہے اور اگر صرف ایک جانب سے شرط لگائی جائے تو جائز ہے۔ (ردالمحتار ۵/۲۵۸)

چنانچہ لاٹری، سٹہ بازی، ریس کورس کی گھڑ دوڑ، تاش، شطرنج، کیرم بورڈ اور دیگر کھیلوں میں ہار جیت پر رقمیں لگانا، کرکٹ، فٹ بال اور ہاکی وغیرہ کے ملکی اور بین الاقوامی کھیلوں میں سٹہ کھیلنا یہ سب قمار اور میسر ہیں۔ گناہ کبیرہ اور حرام قطعی ہیں۔ تمام صحابہ کرام، تابعین اور تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جوئے کی تمام صورتیں قمار میں داخل اور حرام ہیں اور بقول حافظ ابن کثیر اور ابو بکر جصاص رازی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ

﴿والمیسر القمار حتی لعب الصبیان بالکعاب والجوز﴾

"یعنی قمار اور جوئے کی سب صورتیں میسر میں داخل ہیں حتی کہ بچے گٹوں اور اخروٹوں وغیرہ سے جو کھیلتے ہیں وہ بھی اس میں داخل ہے۔"

مخاطرہ خطرہ سے ماخوذ ہے جس میں نفع نقصان دونوں کا خطرہ ہو۔ چنانچہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بہت مال ہاتھ آجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جو ہاتھ آئے گا وہ اپنے پاس سے کچھ دینا پڑے جیسا کہ آج کل لاٹریوں میں ہو رہا ہے۔ مختلف قسم کے سٹے اور لاٹریوں کی قسمیں ایجاد ہو رہی ہیں وہ سب ناجائز ہیں۔ پچھلے زمانہ میں اس میں جس قدر صورتیں اور آئندہ بھی جتنی صورتیں آئیں گی وہ سب ناجائز اور حرام ہیں کیونکہ جوئے میں معاملہ ڈانواں ڈول رہتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مال کا سارا تاوان زید پر پڑ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمام خسارہ عمر کے حصہ میں آجائے۔ البتہ انعام اگر صرف ایک طرف سے مقرر کیا جائے کہ جو شخص فلاں کام کرے گا اس کو یہ انعام ملے گا ایسی صورت میں اگر اس سے کوئی فیس وصول نہیں کی گئی تو اس کو جائز کہا جائے گا کیونکہ اس میں نفع نقصان کے درمیان معاملہ دائر نہیں بلکہ نفع ہونے نہ ہونے کے درمیان دائر ہے۔ چنانچہ صحیح روایات میں شطرنج اور چوسر وغیرہ کو حرام کہا گیا ہے جن میں ہار جیت پائی جاتی ہے جس میں بھی اگر روپیہ کی ہار جیت ہے تو وہ حرام ہے ورنہ "لہو" ہے۔

جوئے میں نفع نقصان کے دونوں پہلو ہیں مگر نقصان کا پہلو غالب ہے اس لیے

جوئے کی بھی بہت سی قسمیں وجود میں آگئی ہیں جن میں بہت سی قسمیں اجتماعی ہیں کہ لوگوں کا تھوڑا تھوڑا روپیہ جمع ہو جاتا ہے اور اس میں جو نقصان ہوتا ہے وہ سب پر تقسیم ہو کر نمایاں نہیں رہتا لیکن جس کو یہ رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس لیے بہت سے لوگ اس شخص کے نفع کو تو دیکھ لیتے ہیں مگر قوم اور دوسروں کے اجتماعی نقصان پر دھیان نہیں دیتے اس لیے ان کا خیال ان نئی قسموں کے جواز کی طرف چلا جاتا ہے۔

حالانکہ اس میں بھی وہ تمام مضرتیں اور خرابیاں موجود ہیں جو چند آدمیوں کے جوئے میں پائی جاتی ہیں بلکہ ایک لحاظ سے اس کا ضرر اس قدیم قسم کے قمار سے بہت بڑھ کر اور اس کے خراب اثرات دور رس اور پوری قوم کی بربادی کا سامان ہیں، کیونکہ ان طریقوں کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے عام افراد کی دولت گھٹتی جائے گی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر محدود افراد اور محدود خاندانوں میں مرتکز ہو جائے گی اور ارتکاز دولت معاشرہ کی ایک بہت بڑی خرابی ہے جس کا مشاہدہ اور تجربہ سٹہ بازار اور قمار کی دوسری قسموں میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے۔

اسلامی معاشیات کا ایک اہم اصول

اس بارہ میں اسلامی معاشیات کا ایک اہم ترین اصول یہ ہے کہ ایسے ہر معاملہ کو حرام قرار دیا گیا ہے جس کے ذریعہ دولت بیشتر لوگوں سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں آ جائے۔ تقسیم دولت کا اصول بیان کرتے ہوئے اس کا اعلان خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ان الفاظ کے ساتھ کیا۔

﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ﴾ حشر ا

یعنی مختلف طبقوں میں مال تقسیم کرنے کا جو اصول قرآن کریم نے مقرر کیا ہے۔

اس کا مقصد اور منشا یہ ہے کہ دولت سمٹ کر چند سرمایہ داروں میں جمع نہ ہو جائے۔

جوا میں بہت سی تمدنی خرابیاں بھی پائی جاتی ہیں کہ شراب کی طرح قمار بھی آپس کے لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد کا باعث ہے۔ ہار جانے والے کو طبعی طور پر جیتنے والے

واسطے سے نفرت اور عداوت پیدا ہوجاتی ہے اور یہ تمدن اور معاشرت کیلئے نہایت مہلک چیز ہے۔

اسی طرح قمار بازی میں مست ہو کر انسان خدا کی یاد ذکر اللہ اور عبادات الٰہی سے بھی غافل ہو جاتا ہے اور پھر اس میں نقصان ہونے پر بازی کے جھگڑے بڑھنے کی حد بھی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہی مشترک اثرات کی وجہ سے دونوں کو اس آیت میں یکجا بیان فرمایا گیا ہے۔

جوئے میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ اس میں بغیر کسی معقول معاوضے کے دوسرے بھائی کا مال لے لیا جاتا ہے گویا لوگوں کا مال غلط طریقے سے ہڑپ کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ قمار میں ایک بہت بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ اس سے بہت سے گھرانے برباد ہو جاتے ہیں، کروڑ پتی کنگال اور قلاش بن جاتے ہیں جس سے جوئے باز ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس کا پورا گھرانہ اور خاندان بلکہ اگر غور کیا جائے تو پوری قوم متاثر ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی ساکھ دیکھ کر جن لوگوں نے اس سے معاملات کیے تھے یا قرضے دیے تھے اب اس کے دیوالیہ ہو جانے سے سب پر اس کی بربادی کا اثر پڑتا ہے۔

جوئے کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کی قوت عمل سست ہو کر فرضی منافع پر لگ جاتی ہے اور وہ بجائے اس کے کہ اپنی دماغی صلاحیت اور ہاتھ پاؤں کی محنت اور مشقت سے دولت کمائے بڑھائے، وہ اسی فکر میں بندھ کر رہ جاتا ہے کہ کسی طرح دوسرے کی کمائی پر قبضہ جمائے۔ غرض یہ کہ اس قسم کی بہت سی خرابیاں جوئے میں پائی جاتی ہیں۔

اوپر والی آیت سے ایک فقہی قاعدہ یہ مستنبط ہوتا ہے کہ کسی شے میں اگر کچھ دنیاوی منافع اور فوائد ہوں مگر نقصانات زیادہ ہوں تو ان غالب نقصانات کی وجہ سے اس کی ممانعت اور حرمت کردی جاتی ہے اور معمولی فائدوں کا خیال نہیں کیا جاتا ہے ورنہ دنیا کی کوئی بری سے بری چیز بھی کچھ نہ کچھ فوائد سے خالی نہیں ہوتی۔ جیسے چوری، ڈاکہ، زنا، اغوا، جھوٹ اور فریب وغیرہ تمام جرائم میں کچھ نہ کچھ فوائد بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان میں فوائد ہوتے تو معمولی قلیل ہیں اور ہوش و حواس رکھنے والا انسان ان کے پاس نہیں پھٹکتا، حالانکہ ان جرائم میں بڑھ چڑھ کر وہی لوگ حصہ بھی لیتے ہیں جو عقل میں بڑھے ہوئے سمجھے جاتے ہیں۔

﴿تجارتی بدعنوانیاں﴾

موجودہ دور میں جب قریباً پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام نافذ ہے۔ اس معاشی نظام میں بہت سی تجارتی سہولتیں اور جائز آسائیاں بھی ہیں لیکن بہت سی تجارتی بدعنوانیاں بھی اس نظام میں موجود ہیں جس کی وجہ سے غریب دن بدن غریب تر اور امیر دن بدن امیر تر ہوتا جا رہا ہے۔ اسلام کا اقتصادی نظام ان تمام بدعنوانیوں کا سد باب کرتا ہے جو عام جہالت اور قابل نفرت سرمایہ داری کو فروغ دیتی ہیں ان بدعنوانیوں میں زیادہ اہم اور مشہور درج ذیل ہیں۔

(۱) احتکار و اکتناز

احتکار کا مطلب یہ ہے کہ دولت سمٹ کر کسی ایک ہی طبقہ میں محدود ہو کر رہ جائے۔ اسلام نے احتکار کی سخت مذمت کی ہے کیونکہ اسلام کے معاشی نظام میں یہ بات ہرگز برداشت نہیں کی جا سکتی کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے۔ اس کے اثرات معاشرہ پر نہایت برے پڑتے ہیں۔ جس طرح خون جب تک تمام جسم میں دورہ نہیں کرتا اس وقت تک جسم صحیح طور پر تندرست نہیں رہ سکتا ہے۔ اسی طرح جب تک دولت تمام معاشرہ میں گردش نہ کرے اور ہر شخص کی جیب تک پیسہ نہ جائے معاشرہ صحیح اور تندرست نہیں رہ سکتا۔ سرمایہ داری کے اس کافرانہ نظام میں دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے اور غریبوں کی جیبوں تک روپیہ نہیں پہنچتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا رہتا ہے جس سے غریبوں کی قوت خرید کم اور امیروں کی قوت خرید زیادہ ہو جاتی ہے۔ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جانے سے غریب کو اپنی غریبی کا احساس ہوتا ہے کیونکہ جب وہ دیکھتا ہے کہ میرا بچہ فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا اور اس کو کوئی دوا نصیب نہ ہو سکی اور اس کے برعکس امیروں کے کتوں کا علاج ہسپتالوں میں ہو رہا ہے تو اس وقت اس کے دل سے اپنی غریبی کے احساس کی ایک ہوک سی اٹھتی ہے کہ میں کیوں غریب ہوا اور

میرے غریب ہونے کے باعث میرا بچہ ہسپتال میں دوائی کے لیے ڈاکٹر نے اس کو دوا نہ دی۔ وہ بغیر دوا کے اس دنیا سے انتقال کر گیا۔ ایک تو وہ غریب تھا اور غریب تو ہمیشہ برے اور برے نظام میں رہے ہیں لیکن اسلامی نظام معیشت میں غریب کو اپنی غربت کا احساس نہیں ہوتا۔ پھر جب غریب یہ دیکھتا ہے کہ ایک طرف امراء اور دولت مند لوگ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہم غریب لوگ بامجبوری ٹھوکروں کی زندگی گزار رہے ہیں تو اس وقت بھی اسے اپنی غریبی کا سخت احساس ہوتا ہے کہ میں غریب کیوں پیدا ہوا۔ اسلام نے اس چیز کو نہایت سختی سے روکا ہے اور پیدائش دولت اور صرف دولت اور تقسیم دولت پر کچھ پابندیاں عائد کیں۔

پیدائش دولت کے باب میں رزق حلال کی تاکید کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں جو لوگ زیادہ سرمایہ دار ہوتے ہیں ان کی پیدائش دولت کے طریقے اکثر و بیشتر ناجائز اور حرام ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسلام نے رزق حلال کی تاکید کی۔ رزق حلال کی جدوجہد ذاتی اغراض کے ٹکراؤ سے معاشرہ کو محفوظ کر دیتی ہے اور انسانی توانائیاں مثبت اور مفید تعمیری کاموں پر مرکوز ہو جاتی ہیں جس سے دولت کی پیدائش کا عمل تیز اور مفاسد سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ معاشرہ کے تمام افراد کو اپنی صلاحیتیں بے کار چھوڑنے کے بجائے مفید پیداواری کاموں میں صرف کرنی چاہئیں کیونکہ گداگری اور طفیلی پن کی ہر شکل معاشرہ کے توازن کو خراب کر دیتی ہے۔

اسلام نے اکتساب مال کے تمام ناجائز ذرائع کی سختی سے ممانعت کر دی ہے۔ فحشیات، سود، جوا، رشوت، لاٹری، چوری، ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکیٹ، فحش اور مخرب اخلاق اشیاء کی پیدائش اور فروخت، نجومی گری، عصمت فروشی، رقص و سرود، غصب اور اس طرح کی دیگر اشیاء کی سرگرمیوں کے ذریعہ روزی کمانا اور ان کی خرید و فروخت اور ان کی پیدائش میں کسی قسم کی معاونت کو حرام اور ناجائز قرار دے دیا گیا ہے کیونکہ ان سے لاتعداد اور ان گنت معاشی، اقتصادی، معاشرتی، سماجی اور اخلاقی مفاسد جنم لیتے ہیں اور معاشرہ کے حسن اور اس کے سکون کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اسلامی نظام معیشت میں غصب اور غرر، جبر و اکراہ اور بے گار اور اس قسم کے دیگر ذرائع آمدنی کی بھی ممانعت کر دی گئی

کیونکہ اس سے نہ صرف انسانی عظمت پر دھبہ لگتا ہے بلکہ معاشی سرگرمیوں کا توازن بھی یک قلم بگڑ جاتا ہے جب دولت کی پیدائش پر اس قدر پابندیاں اور قدغنیں ہوں تو یقین جانئے کہ اس زمانہ میں کوئی شخص کروڑ پتی اور ارب پتی ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی غریب اتنی غربت کی زندگی بسر کر سکتا ہے جس میں اس کو اپنی غربت کا احساس ہو۔

پھر اگر کوئی شخص اتنی پابندیوں کے باوجود کروڑ پتی اور ارب پتی ہو بھی جائے تو شریعت نے صرف دولت پر بہت سی پابندیاں لگا دیں اور دولت کو خرچ کرنے کے ہر ایسے ذریعہ سے منع فرما دیا جس میں بخل اور اسراف کی بو آتی ہو۔ اسلام نے دولت کے خرچ کرنے کے باب میں کفایت شعاری اور میانہ روی کو اپنانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس نے مال خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کی وہ کبھی تنگ دستی سے دوچار نہیں ہوگا۔" کفایت شعاری سے مراد جائز حاجات پر جائز حد تک مال صرف کرنا ہے۔ کفایت شعاری اور میانہ روی انسان کو بہت سے معاشی، معاشرتی اور ذہنی عوارض سے محفوظ کر دیتی ہے۔ اس سے بچتیں (Savings) جمع ہوتی ہیں اور پیداواری عمل کو تیز کرنے کیلئے وسائل میسر آتے رہتے ہیں جو جدید معاشیات میں از حد ضروری ہیں۔

کفایت شعاری اور میانہ روی کی تلقین کے ساتھ ساتھ اسلام نے اسراف اور تبذیر کی شدت کے ساتھ ممانعت کر دی۔ ان دونوں سے نہ صرف وسائل کا بے دریغ ضیاع عمل میں آتا ہے بلکہ دولت پیداواری وسائل اور کاموں میں صرف ہونے کے بجائے تمام لہو و لعب، فخر و ریا اور فسق و فجور کی شیطانی راہوں پر بہ جاتی ہے۔ اسراف و تبذیر سے انسان عیش کوشی کا رسیا ہو کر خلیفۃ اللہ کے بلند مقام سے اخلاقی پستی کی انتہاء گہرائیوں میں گر کر اپنے انسانی جوہر سے محروم ہو جاتا ہے۔

اسراف و تبذیر کی مذمت کے ساتھ ساتھ اسلام نے بخل اور شح کی بھی مذمت کی اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب و سزا کی سخت وعید بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ۝ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ۝ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا﴾ [النساء: ۳۶-۳۷]

"بے شک اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو (دل میں) اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوں (زبان سے شیخی اور فخر ومباہات کی باتیں کرتے ہوں) جو خود بھی بخل کرتے ہوں اور دوسروں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے ہوں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے اس کو چھپاتے ہوں اور ہم نے ایسے ناشکروں کیلئے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

آیت میں ہے "دوسروں کو بخل کی تعلیم دیتے ہوں" عام ہے کہ اپنی زبان سے ان کو ترغیب دیتے ہوں یا اپنے عمل سے تعلیم دیتے ہوں کہ ان کے عمل کو دیکھ کر دوسروں کو بخل کی ترغیب ہوتی ہو۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ "مختالاً فخوراً" سے مراد وہ متکبر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطاء کی ہوئی چیزوں کو گن گن کر رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتا۔ مولانا تھانوی قدس سرہ نے لکھا ہے کہ آیت میں "مختال فخور" آیا ہے جس کا ترجمہ اترانے والا شیخی باز کیا ہے۔ اترانا اپنے آپ ہوتا ہے یعنی دوسرے کے بغیر بھی ہوتا ہے اور شیخی دوسرے کے سامنے اور دوسرے کے مقابلہ میں ہوا کرتی ہے اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ "اختیال" تو ایسی چیزوں پر اترانا ہوتا ہے جو ذات کے اندرونی کمال ہوں اور فخر ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو خارجی ہوں جیسے مال اور جاہ وغیرہ۔ (بیان القرآن)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ﴾

[توبہ: ۳۴-۳۵]

آقا اور مالک بن جاتے ہیں تو غلام اور مزدور کون ہو؟ علاوہ ازیں خود قرآن نے کہا ہے کہ "انسان سرکش ہوتا ہے جب وہ اپنے میں استغناء دیکھتا ہے۔" یعنی مال و زر یا استغنا سے اس میں سرکشی اور بغاوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ کتابوں میں ہے کہ عرب میں جس سال پیداوار کی کثرت ہوتی تو عرب ایک دوسرے کو قید کرنا اور قتل کرنا شروع کر دیتے اور جب قحط پڑ جاتا تو یہ سب کچھ چھوڑ دیتے۔

قرآن میں ان آیات کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات آئی ہیں جن میں بخل اور شح کی مذمت کی گئی ہے اور لوگوں کو اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی اور جو اللہ کے راستے میں مال خرچ نہیں کرتا اس کے لیے دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ قرآنی آیات کے علاوہ حدیث کا بھی بہت بڑا ذخیرہ ہے جس میں لوگوں کو غرباء پر مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ بخاری اور مسلم میں حدیث ہے کہ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "میں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا آپ ﷺ اس وقت بیت اللہ کی دیوار کے سایہ میں تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھ کر سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: "رب کعبہ کی قسم! وہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں!" میں نے عرض کیا: "میرے ماں باپ آپ پر قربان! وہ کون لوگ ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "جن کے پاس مال زیادہ ہے مگر وہ لوگ جو ادھر ادھر اس طرح اس طرح خرچ کریں اپنے دائیں سے بائیں سے آگے سے پیچھے سے لیکن ایسے آدمی بہت کم ہیں۔"

(وقلیل ما هم: مسلم ۲۳۰۰، ترمذی ۶۱۷)

اس روایت میں یہ بیان کیا گیا کہ مال و دولت کی کثرت فی ذاتہ کوئی خوب چیز نہیں ہے بلکہ بڑے خسارے اور نقصان کی چیز ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ سے غفلت کا سبب بنتی ہے۔ روزمرہ کا یہ مشاہدہ ہے کہ تنگ دستی کے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع بہت کم ہوتا ہے اور جو لوگ چاروں طرف نیکی و سخا کا ہاتھ پھیلاتے ہیں ان کے لیے مال مضر نہیں ہے۔ لیکن آپ نے حدیث کے آخر میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ایسے آدمی بہت کم ہیں۔ عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ جہاں مال و دولت کی کثرت ہوتی ہے فسق و فجور، آوارگی، عیاشی اور

کے بعد بچ جانے والے وسائل مستحق حاجت مندوں کی حاجت روائی کیلئے خرچ کیے جائیں یہ انفاق نہ صرف خیر و برکت اور رضائے الٰہی کے حصول اور غرباء، مساکین اور حاجت مندوں کی پر خلوص دلی دعاؤں کا باعث بنے گا بلکہ اس سے مؤثر طلب (Effective Demand) میں بھی اضافہ ہوگا اور پیداواری سرگرمیوں میں تیزی کا رجحان بھی پیدا ہوگا۔

یہ ساری وہ چیزیں ہیں جن سے احتکار کا قلع قمع ہوگا اور دولت سمٹ کر کسی ایک طبقہ میں یا چند ہاتھوں میں محصور اور محدود نہ ہوگی بلکہ پورے معاشرہ میں گردش کرے گی اور ہر شخص اس سے مستفید ہوگا اسلام ہی وہ دین ہے جس نے سرمایہ داروں کو احتکار سے روکا۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لا يحتكر الا خاطئ﴾

(ابو داؤد، جلد ۲ ص ۱۳۲، ابن ماجہ نمبر ۲۱۵۴)

''احتکار کرنے والا گناہ گار اور خطا کار ہے۔''

(والحديث اخرجه ايضا مسلم في المساقاة والترمذي في البيوع، وابن حبان جلد ۱۱ ص ۳۰۸، وابن ابي شيبة جلد ۶ ص ۱۰۲، والبيهقي في السنن الكبرىٰ جلد ۶ ص ۳۰، والبغوي في شرح السنة جلد ۸ ص ۱۷۹، والحاكم جلد ۲ ص ۱۴)

امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک احتکار صرف غذائی اشیاء میں ہے۔ (ملاحظہ ہو مغنی ابن قدامہ جلد ۴ ص ۲۴۳، نووی شرح مسلم جلد ۱۱ ص ۴۳) لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک احتکار کی حرمت صرف غذائی اشیاء میں نہیں ہے بلکہ ہر وہ شی جس سے عامۃ الناس کو ضرر پہنچے اس کا چند لوگوں میں سمٹ جانا اور اس کا روک رکھنا احتکار ہے اور حرام ہے۔ (ردالمحتار جلد ۵ ص ۲۸۲) امام شوکانیؒ نے لکھا ہے کہ اس شی کا روک رکھنا احتکار کہلاتا ہے جس سے انسانوں اور جانوروں کو تکلیف پہنچے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے احتکار کرنے والے کے بارہ میں ارشاد فرمایا:

زمانے کے حالات میں رائج ہے۔ ہمارے ملک میں جو روزانہ کروڑوں روپے کا سٹے کا کاروبار ہوتا ہے اور سٹے میں چونکہ کاروباری سرگرمیاں اور کمپنیوں کے مستحکم ہونے کی بنیاد پر صرف کاغذات اور ٹیلی فون پر ہونے والی وغیرہ کی بنیاد ہوتی ہے اور عملی طور پر کوئی خرید و فروخت نہیں ہوتی اور منافع پر قبضہ کیا جاتا ہے اس لیے شریعت میں یہ کاروبار ناجائز ہے۔

سٹے کا یہ کام قمار میں شامل ہوتا ہے اور قمار کے بارے میں ارشاد باری ہے:

﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا﴾ (بقرہ ۲۱۹)

"لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کیلئے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔"

شراب اور جوا عربوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا اور عرب شاعروں نے اپنے قصائد میں جوئے اور شراب کا کثرت سے ذکر کیا ہے۔ عرب لوگ شراب پیتے اور جوا کھیلتے اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کرکے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کرتے اور ان ٹکڑوں پر پانسے ڈال کر نام نکالتے۔ ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لیتے تھے جن کے نام یہ ہیں۔

فذ، توام، رقیب، حلس، نافس، مسبل، معلی، منیح، سفیح، وغد۔ ان میں سے ہر تیر کے حصے مقرر کر لیے تھے اور جب تیر کھینچتے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے۔ وہ ایک ایک تیر کو ایک ایک نام پر نکالتا جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے اور جن جن کے حصے مقرر تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تیروں پر کوئی حصہ نہ تھا وہ جن کے نام پر نکلتے وہ ناکام ہوتے۔ اس طرح جو گوشت الگ ہوتا وہ فقیروں، غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتے چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اس لئے قمار

نزدیک ان کی یہ بات درست نہیں ہے بلکہ یہ دراصل ان فوائد کی طرف اشارہ ہے جو اس
وقت کی عرب سوسائٹی میں مخصوص روایت کی بنا پر بڑے جاتے تھے یعنی شراب پی کر جوا
کھیلنا اور جوئے کے نتیجہ میں جو کچھ دستیاب ہوتا اسے غریبوں میں تقسیم کر دینا۔ یہ ان کے
یہاں بڑی اونچی بات تھی اور اسے کرامات میں شمار کیا جاتا تھا۔ قرآن حکیم یہاں انہی رواجی
فوائد کی طرف اشارہ کر رہا ہے ورنہ قرآن کو اشیاء و اعمال کے طبی اور مادی فوائد سے کوئی
سروکار نہیں ہے۔ قرآنی بلاغت کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اگر طبی اور مادی فوائد قرآن حکیم کے
پیش نظر ہوتے تو آیت میں نفع کا مقابل اثم سے نہیں ضرر سے ہوتا۔ اثم کا لفظ بھی نقصانات
کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی مفاسد اور گناہوں کے لیے آتا ہے۔ اگر شراب کے
طبی نفع کی وضاحت کرنی پیش نظر ہوتی تو نفع کے مقابلہ میں ضرر کا لفظ آتا "اثم" نہ آتا۔

اس آیت کے علاوہ قرآن حکیم میں سورۃ المائدہ میں فرمایا:

"بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے یہ سب گندے اور نجس ہیں
اور کار شیطان ہیں، بس تم ان سے بچو" (مائدہ۔۹۰)

قمار بازی جس میں لاکھوں اور کروڑوں کی دولت لوگوں کو اس طرح مل جاتی ہے
کہ ملک کے کسی باشندے کو اس کے معاوضہ میں کچھ نہیں ملتا۔ جوئے میں جیتنے والے بغض
وغضب سے بھرے ہوئے دل سے مال دیا جاتا ہے شاید اتنا غصہ اور اتنی نفرت چور اور ڈاکو پر
بھی اس وقت نہیں ہوتا جس کا مال چوری ہو جاتا ہے۔

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ اس قسم کے بیع و معاملات کی
خباثت یوں فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حق تعالیٰ شانہ نے جب مخلوق کو پیدا فرمایا اور اس کو [illegible] ان کی
معاش کا انتظام فرمایا اور ان سے فائدہ اور نفع حاصل کرنے کا ان کو
موقع فراہم کیا تو انسانوں کے درمیان جھگڑے، دشمنی اور کشمکش پیدا
ہوئی۔ تب حق تعالیٰ شانہ کے قانون کا یہ فیصلہ ہوا کہ جو شخص ذاتی

محنت مزدوری، وراثت یا دوسرے کسی جائز اور صحیح طریقے سے کسی شے کا مالک
ہے اس کی چیز میں دوسرا کوئی شخص مزاحمت اور کسی قسم کا حق دار نہیں
ہے۔ البتہ دوسرے کو بدل کے ذریعہ خریداری اور معتبر و صحیح
رضامندی کے ساتھ معاملہ سے اس شے کو حاصل کرنے کا حق ہے
بشرطیکہ خرید وفروخت کرنے والوں کے درمیان اس معاملہ کا علم
ویقین ہو، اور فریب، چال بازی اور دھوکہ دہی کا اس میں کوئی شائبہ
نہ ہو اور جب کہ انسان مدنی الطبع ہے اور اس کی معیشت باہمی تعاون
کے بغیر ناممکن ہے تو اللہ تعالیٰ نے باہمی تعاون کو بھی ضروری قرار دیا
ہے پس اگر کوئی معاملہ اس طرح کیا جائے جس میں نہ صحیح بدل موجود
ہو اور نہ ہی باہمی تعاون پایا جاتا ہو بلکہ دوسرے کو نقصان دے کر نفع
حاصل کرنا مقصود ہو۔"

جیسے قمار (جوا) یا اس میں صحیح رضامندی موجود نہ ہو جیسے سود تو یہ تمام
طریقے باطل و ظلم ہیں اور ایسے معاملات ناجائز اور حرام ہیں۔

(حجۃ اللہ البالغہ، جلد ۲، ص ۱۰۳)

ایک اور مقام پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں:

"جوئے میں لوگوں کے مال کو اس طرح اچک لیا جاتا ہے کہ اس میں بالکلیہ
جہالت، حرص اور جھوٹی آرزوؤں کے ہاتھوں آدمی گرفتار ہو جاتا ہے اور دھوکے کی
گاڑی پر سوار ہو کر اس میدان میں کودتا ہے اور حرص اور غلط آرزو و تمنا اس کو ان
خطرات کے منہ میں پہنچنے پر آمادہ کر دیتی ہیں جن میں معاشرتی زندگی کی تعمیر میں اور نہ
باہمی امداد و تعاون میں دخل ہے۔ ہارنے والا اگر ہارنے کے بعد خاموش ہو جاتا ہے
تو اس کی یہ خاموشی غصہ اور اپنی ناکامی و نامرادی کی چنگاریوں پر ہوتی ہے جن میں
وہ جلا رہتا ہے یا پھر لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچتی ہے اور جیتنے والا اپنی جیت سے لذت اندوز ہوتا ہے اور اس کا

کاروبار اور اس کی چھوٹی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی ہے اور انسان کو اس فعل سے باز رہنے کی اجازت نہیں دیتی بالآخر تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کا تاوان خود ہی اس کے سر پر مسلط ہو جاتا ہے۔"

"اگر کسی ملک کے باشندوں میں جوئے بازی کی اس عادت بد کا رواج پیدا ہو جاتا ہے تو بالآخر اس کا نتیجہ ملک کی دولت و ثروت کے انتظام میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور باہم ایک طویل جھگڑوں کی بنیاد پڑ جاتی ہے اور حصول معاش کے جو صحیح اور مرغوب ذرائع ہیں ان کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں لوگ باہمی امداد و اعانت سے یکسر بے پرواہ ہو جاتے ہیں جس پر تمدن کی بنیاد قائم ہے۔"

اور آخر میں حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"دوسروں کی خبر سے خود معائنہ اور مشاہدہ تمہیں بے نیاز کر سکتا ہے۔ آج جواریوں میں تم نے ان امور کے سوا جن کا میں نے ذکر کیا ہے کبھی کسی اور چیز کا بھی مشاہدہ کیا ہے؟"

بہر حال ملک کی معاشی قوتوں کا ایک بڑا حصہ موجودہ نظام معیشت میں قمار کے ذریعے ضائع ہو جاتا ہے اس لیے اسلام نے صرف قمار کی حقیقی شکلوں کو نہیں بلکہ جن معاملات میں تھوڑا بہت بھی قماری رنگ پیدا ہو جاتا ہے جیسے سٹہ، سلسلہ وغیرہ ان کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں یورپ نے اسلام کے قانون سے باغی ہو کر اپنے ہاتھوں اپنا جو حال کیا ہے اور کر رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ خودکشی اور اقدام خودکشی کے کتنے واقعات قمار بازی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ پھر مالی ابتری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ یورپ کی پہلی جنگ عظیم سے پہلے انگلستان (England) سے متعلق تخمینہ ہے کہ کم از کم دس کروڑ پونڈ سالانہ کی رقم اپنے مالکوں کے قبضہ سے نکل کر جواریوں کے ہاتھ پہنچتی ہے یہ تخمینہ یورپ کے صرف ایک ملک اور ایک چھوٹے سے رقبے سے متعلق تھا اور وہ بھی جنگ عظیم

ہوں گے ان میں انعام اس شخص کو دیا جائے گا جس کا نام لاٹری یا قرعہ اندازی کے ذریعے نکل آئے۔ یہ قمار کی ایک صورت ہے اور شرعی طور پر ناجائز ہے۔

بعض شہروں میں بچے بادام، اخروٹ یا کانچ کی گولیاں وغیرہ سے ہار جیت کرتے ہیں اور اس پر شرطیں لگاتے ہیں۔ یہ بھی قمار وغیرہ میں داخل ہے آج کل تو بڑے پیمانے تک کرکٹ اور دوسرے کھیلوں پر بھی شرطیں لگائی جاتی ہیں یہاں تک کہ بعض شہروں میں کنکوے اڑا کر پیسوں کی ہار جیت کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اس طرح سٹہ بازی کا سارا کاروبار قمار ہی ہے جو قرآن کی نص کے مطابق حرام ہے۔ اس کاروبار میں کسی قسم کی اعانت بھی حرام ہے۔ بیمہ کے کاروبار کو امداد باہمی کا نام دے کر جائز قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس کی مروجہ صورتیں جتنی ہمارے علم میں ہیں سود اور قمار سے خالی نہیں اس لیے حرام ہیں۔

﴿سود﴾

احتکار کی سب سے ملعون قسم ''سودی لین دین'' ہے۔ یہ تمام اقتصادی اور معاشی نظام کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ کروڑوں انسانوں کو مفلس اور نان شبینہ کا محتاج بنا کر دولت کا سیلاؤ ایک مخصوص طبقہ کی طرف کر دیتا ہے۔ سود سرمایہ دارانہ نظام کا ایک اہم اور مضبوط ستون ہے اور اس نظام کی عمارت کا زیادہ تر انحصار اسی پر ہے۔

ربا یا سود ایک قدیم کاروباری مسئلہ ہے اور دنیا کی اکثر قومیں اس کاروبار کو کرتی رہی ہیں لیکن کسی زمانہ میں اس کو اچھا کام نہیں سمجھا گیا۔ سود خور اگرچہ لوگوں میں رہتا تھا لیکن معاشرہ میں اس کی حیثیت عموماً ایک مجرم کی سی جاتی تھی جو لوگوں کا خون پیتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سود خور خود بھی اپنے کو مجرم خیال کرتا تھا۔ اس جرم کے گھناؤنے پن کی وجہ سے قرآن نے ابتدائی سخت لہجوں میں ''سود خوری'' کے جرم کی مسلسل سزاؤں کا اعلان شروع کر دیا۔ سزائیں بھی ایسی شدید کہ بڑے سے بڑے کبیرہ گناہ کے بارہ میں بھی سزاؤں کی اتنی شدت قرآن حکیم میں نہیں ملتی۔ شیطانی آسیب زدوں کی شکل میں سود خور اٹھے گا۔ کثیر دولت کی تمام کوششوں کو اس کی قدرت برباد کر کے رکھ دے گی جہنم میں دائمی ابدی عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا اور آخر میں تو قرآن نے اعلان کر دیا کہ جو شخص سود خوری سے رکنے اور توبہ کرنے پر آمادہ نہیں ہے چاہیے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو اعلان جنگ دے دے۔ علماء نے بھی لکھا ہے کہ کسی جرم پر خواہ وہ انسان کی زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق ہو قرآن حکیم میں اتنی سزاؤں کی دھمکی نہیں دی گئی ہے۔ چونکہ سود خوری ایک معاشی جرم ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے معاشی مسائل کو کس قدر اہمیت دی ہے لیکن قرآن کی سخت سزاؤں کے مقابلہ میں جاہل عربوں کے قلوب بھی شدید سخت ہو گئے تھے لہٰذا جوازِ سود پر انہوں نے بھی استدلال پیش کیا۔

﴿إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَوٰا﴾

"یعنی بیع (خرید و فروخت) کے معاملات کی طرح تو سود کا معاملہ ہے۔"

مطلب یہ کہ بیع کے معاملے میں بھی مال کا مبادلہ مال سے ہوتا ہے اور سود میں بھی مال کا مبادلہ مال ہی سے کیا جاتا ہے تو پھر دونوں میں فرق کیا ہے؟ جب قرآن بیع کے معاملہ کو جائز اور حلال قرار دیتا ہے اور سود کے معاملے کو ناجائز اور حرام اور دونوں کی باتیں یکساں ہوں کے ساتھ اس کی عقلی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ قرآن حکیم نے ان کے اس عقلی اعتراض کا عقلی جواب تو نہیں دیا بلکہ جواب میں یہ کہا کہ "خدا کا حکم یوں ہی ہے کہ بیع کو حلال کیا ہے اور "ربوا" (سود) کو حرام کر دیا ہے" اس کے بعد پھر ان ہی باتوں کا ذکر کیا ہے جن کو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ پورا عرب ایک انتہائی کم عرصہ میں مسلمانوں سے مغلوب ہو گیا اور اس زمانہ کی دو سپر پاورز (Super Powers) کو بھی اسلامی مجاہدوں کے سامنے اپنا سر جھکانا پڑا۔ اسلامی حکومتوں نے پوری مملکت میں نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی سودی لین دین کو ناجائز ٹھہراتے ہوئے ایک عام صورت ایسی پیدا کر دی کہ پھر صدیوں "جواز سود" کی طرف کسی کا خیال تک نہیں گیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں، ایک تو یہودی اکثر قوموں میں بھی سودی کاروبار بدنام تھا اور دوسرے اسلام کا سیاسی اقتدار جب اس کرہ ارض پر قائم ہوا تو جیسا کہ قاعدہ ہے کہ ہر چیز کی بھلائی اور برائی کا معیار اس زمانہ میں اسلام ہی کا قائم کردہ ٹھہر گیا۔ کیونکہ سیاسی غلبہ کا یہ ایک عام اثر ہے جس سے دنیا ہمیشہ متاثر رہی ہے۔ وہ آج بھی متاثر ہے۔ چنانچہ کسی چیز کی بہتری کی سب سے بڑی دلیل اس زمانہ میں بھی یہی ہے کہ جن قوموں کو آج دنیا میں سیاسی اقتدار حاصل ہے یہ ان کا قول یا عمل ہے۔ یورپ کے موجودہ تمدن کی ظاہری چمک دمک اور رنگ و روغن نے لوگوں کے دلوں کو ایسا اپنی طرف کھینچا ہے کہ دلائل کے بجائے یورپ کا طرز عمل ہی مسائل کے خطا وصواب اور حق و باطل کے معلوم ہونے کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ یورپ نے اس کا کیا فیصلہ کیا ہے اور ان کا اس بارہ میں طریقہ کار کیا ہے۔ اب ہر وہ مسئلہ جو اس کے مطابق نہیں وہ خطا اور ہر وہ عمل جو اس کے موافق نہیں وہ شر اور دقیانوسیت بلکہ جہالت ہے۔ چنانچہ آج کل کے اکثر مدعیان عقل کے نزدیک تحقیق کی یہی کسوٹی رہ گئی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہم کو اس کی بدولت اپنے

بات اصل میں یہ ہے کہ زمانہ بدلا اور وقت نے کروٹ لی اور مسلمانوں کے سیاسی غلبے نے بتدریج مغلوبیت کا رنگ پھر اس جگہ اختیار کیا جہاں وہ غالب تھے۔ اب معیار بدل گیا۔ اسلام کی طرف کسی شے کا انتساب بھی جب اس کی خوبی کی دلیل تھی یہ بات جاتی رہی۔ ادھر یورپ جس کو مسلمانوں کی مغلوبیت کے بعد دنیا کا سیاسی اقتدار ملا، وہ کلیسائی آویزشوں کے سلسلہ میں بالآخر اس نتیجہ تک پہنچا کہ کلیسا کے ساتھ ساتھ اس نے مذہب کا بھی قریب قریب انکار کر دیا۔ سود حالانکہ عیسائیت میں بھی کوئی اچھا عمل نہیں تھا جس کا کلیسائی عہد تک یورپ پابند تھا لیکن مذہب اور کلیسا کے اقتدار کو ختم کر دینے کے بعد یورپی لوگوں کے نزدیک "سود خوری" مذہبی نقطہ نظر سے ناپسندیدہ فعل ہے، ناقابل توجہ بات بن گئی، لہٰذا انہوں نے سوال اٹھایا کہ خالص عقلی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے کہ "سود" کی کیا حیثیت ہے؟ چنانچہ علمائے معاشیین نے اس پر بحث کرنی شروع کی اور جاہلی عرب کی وہ مردود دلیل لوگوں کے سامنے پیش کی جس کو قرآن چودہ سو سال قبل رد کر چکا تھا۔

﴿إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا﴾

یورپ کے ارباب فکر و نظر نے اس دلیل کو نئے سرے سے پھر زندہ کیا اور اپنی اپنی حکومتوں کو متاثر کر کے "سود خوری" کے کاروبار کو قانونی جواز کی سند عطا کی اور سودی کاروبار کے مختلف نئی شکلوں میں منظم کرنے کی کوشش کی۔

معاشیات کے ماہرین نے جن میں یہودی ذہنیت والوں کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا، ہر اس شخص کے لیے سود خوری کے مواقع فراہم کر دیے جو اپنی آمدنی سے معمولی سی رقم بھی پس انداز کر سکتے ہیں تاکہ ان کی اس پس انداز آمدنی کا سود انہیں بغیر کسی فکر اور تردد کے باقاعدہ ملتا رہے۔ اس کے علاوہ کاروبار کے ہر طریقے میں اور لین دین کی دوسری راہوں میں بھی اس "سود" کی لعنت کو کچھ اس طرح جذب کر دیا گیا کہ تمام کاروبار کرنا بھی عوام الناس کے لیے بغیر سود لینے اور دینے کے قریباً ناممکن ہو گیا۔ برصغیر پاک و ہند، مصر اور دوسرے اسلامی ممالک میں بھی بعض لوگوں کے ذہنوں میں "جواز سود" کی دلیل ڈال دی گئی۔ علماء نے اس بارہ میں کافی دلائل دیے، ضخیم کتابیں لکھیں، فتوے دیے لیکن یورپ کے

سیاسی اقتدار کا اثر لوگوں کے ذہنوں پر کچھ اس طرح ہوا کہ عقلی دائروں میں جاہلی عرب کے استدلال کی جیت ہوگئی اور مذہب اس میدان میں ہار گیا اور بات یہاں تک پہنچی کہ اسلامی نظریہ پر قائم شدہ پاکستان کی سپریم کورٹ میں حکومت کے وکیل نے یہ بیان دیا کہ پاکستان کی معیشت سود کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ اس کی اس دلیل کو قبول کرتے ہوئے حرمت سود کے ایک مدلل اور ضخیم فیصلہ کو معرض التواء میں ڈال دیا گیا بلکہ قریباً قریباً ختم کر دیا گیا۔

پھر بعض حضرات شخصی مہاجنی قرضہ پر سود کو ناجائز بتاتے ہیں اور چند اشخاص کی مجموعی کاروباری شکل کو جس کا نام ستر ہویں صدی کے شروع میں بینکنگ سسٹم پڑا، جائز سمجھتے ہیں۔ گویا ان کا یہ کہنا ہے کہ چوری تو ناجائز ہے لیکن ڈاکہ جائز ہے یعنی ایک جرم تنہا ایک آدمی کرے تو وہ تو ناجائز اور معاشرہ کیلئے مضر ہے مگر جب اس جرم کو سازش کر کے چند آدمی مل کر کریں تو وہ جائز ہو جائے گا۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق سود سے کبھی بھی کوئی قومی فلاح یا دنیوی بہبود پیدا نہیں ہو سکتی۔ قرآن کا فیصلہ ہے اور اٹل فیصلہ ہے اور دنیا نے اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں اس کی تصدیق بھی کی ہے۔

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ﴾ بقرہ: ۲۷۶

"بے شک اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے۔"

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سودی کاروبار سے ملک کی دولت میں ترقی ہوتی ہے لیکن یہ محض فریب نظر اور دھوکہ ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ مہاجنی قرضہ کے سود سے ملک کے صرف چند اشخاص کی دولت بڑھتی ہے اور سارے اہل ملک کی دولت گھٹتی ہے۔ بینکنگ اور کوآپریٹو سوسائٹیز کے سسٹم میں چند اشخاص کے بجائے سینکڑوں اشخاص کی دولت کو ترقی ہوتی ہے مگر اس کے مقابلہ میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کی دولت کم ہوتی ہے اور تب ان سینکڑوں کی دولت بڑھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سود کو جس حیثیت سے بھی رواج دیا جائے وہ اپنی تباہی پھیلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

قرض انسان کی ایک ضروری حاجت ہے۔ اس حاجت کو پورا کرنا اسلام نے

قانون کے بجائے اخلاق سے کیا ہے۔ اس لیے ضرورت مندوں کو قرض دینا ثواب کا کام بتایا ہے اور اس قرض پر مقروض سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا سود قرار دیا گیا ہے۔ اہل تقویٰ نے تو اس باب میں یہاں تک احتیاط کی ہے کہ مقروض کے پاس دعوت کا قبول کرنا بھی مشتبہ بتایا ہے بلکہ لوگوں کو ہدیہ اس غرض سے دینا بھی کہ ان سے کچھ زیادہ وصول کا موقع ہے ربا (سود) میں شامل کیا ہے۔

ضرورت مند کو قرض دینا اسلام نے ثواب کا بہترین عمل بتایا ہے لیکن جو لوگ قرض لے کر استطاعت کے باوجود ادا کرنے میں دیر کریں ان کو ظالم کا لقب دیا گیا ہے اور جو لوگ بے قرض ادا کیے مر جائیں ان کے ترکہ میں سب سے پہلے قرض ادا کرنا ضروری قرار دیا اور قرض ادا کیے بغیر اگر وہ مر جائیں تو ان کی نماز جنازہ پڑھنے میں بھی تامل کیا گیا ہے۔ اسلام نے قرض کے لیے حکومت سے کہا ہے کہ وہ لوگوں کو بغیر سود قرض دینے کا انتظام کرے۔ چنانچہ خلافت راشدہ میں بیت المال سے قرض لیا جاتا تھا جس کی ادائیگی اگر مقروض اپنی زندگی میں کسی وجہ سے نہ کرتا تو اس کی متروکہ جائیداد اور دولت سے اس کی وصولی عمل میں آتی۔ خلاصہ یہ کہ اسلام نے سود کی نہایت مذمت کی ہے لیکن موجودہ زمانے میں سرمایہ دارانہ نظام نے سود کو اتنا عام کر دیا ہے کہ ایک عام آدمی کے لیے اس سے بچنا مشکل ہو گیا ہے خصوصی طور پر بینکنگ سسٹم نے ہر آدمی کو سود میں کسی نہ کسی صورت میں ملوث کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص بینک سے سود نہیں لیتا تو وہ اس سودی ادارے کے سود لینے کے گناہ میں شریک ہے۔

سود کیا ہے؟

قبل اس کے کہ ہم سود پر کوئی مزید بحث کریں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ بتایا جائے کہ سود ہے کیا؟ اور اس کی حدود کیا ہیں؟ اور اس کی حرمت کے احکامات کن معاملات سے متعلق ہیں؟ اور اسلام سود کو ختم کر کے معاشی معاملات کو کن خطوط پر چلانا چاہتا ہے۔ قرآن حکیم میں سود کیلیے جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ "ربا" ہے۔ ربا کس کو کہتے ہیں اور

جاہلیت کا ربوا:

زمانہ جاہلیت میں ربوا کا اطلاق جن قسم کے معاملات پر ہوتا تھا روایات میں ان کی صورتیں ذکر کی گئی ہیں۔

(۱) سیدنا مجاہد فرماتے ہیں کہ جاہلیت کا ربوا یہ تھا کہ ایک شخص کسی سے قرض لیتا اور کہتا کہ اگر تو مجھے اتنی مہلت دے تو میں تجھے اتنا زیادہ دوں گا۔

(۲) قتادہ کہتے ہیں کہ جاہلیت کا ربوا یہ تھا کہ ایک شخص کسی سے کوئی چیز لیتا اور اس کی ادائیگی کے لیے مہلت ہوتا اگر یہ مہلت گزر جاتی اور وہ ادائیگی نہ ہوتی تو مزید مہلت ملتی اور رقم میں اضافہ ہو جاتا۔

(۳) ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ دور جاہلیت میں لوگ ایک دوسرے سے قرض لیتے اور باہم یہ طے کر لیتے کہ اتنی مدت میں رقم اصل زر سے زیادہ ادا کی جائے گی۔

کاروبار کی یہ صورتیں عرب میں رائج تھیں اور انہی کو اہل عرب ربوا کہتے تھے اور اسی ربوا کی حرمت کا حکم قرآن میں نازل ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل طائف، مکہ، مدینہ وغیرہ میں سود کا کاروبار عام ہوتا تھا۔ طائف میں قبیلہ ثقیف جاہلیت میں بنو مغیرہ کو قرض دیتے تھے۔ جب واپسی کی مدت آ پہنچتی تو بنو مغیرہ کہتے کہ ہم زیادہ دیتے ہیں ہمیں مہلت دو۔ تفسیر ابن جریر میں ہے کہ طائف میں قبیلہ ثقیف کے چار بھائی مسعود، عبد یالیل، حبیب بن عمرو بن عمیر ثقفی تھے۔ یہ بنو مغیرہ کو قرض دیتے اور ان سے سود وصول کرتے تھے۔ طائف کی فتح کے بعد یہ چاروں مسلمان ہو گئے ادھر مکہ میں بنو مغیرہ بھی مسلمان ہو گئے جب ان بھائیوں نے بنو مغیرہ سے سود مانگا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ "سود طلب نہ کرو۔"

اسی طرح اہل مکہ بھی سودی کاروبار کرتے تھے۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ اور سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے زمانہ جاہلیت میں شراکت کی تھی اور سودی کاروبار کرتے تھے۔ جب سود حرام ہوا تو انہوں نے سود کی بہت بڑی رقم جو عمرو بن عمیر کو چھوڑ دی۔

اسی زائد رقم کو سود کہتے ہیں جو صرف مہلت کا معاوضہ ہے۔ اس لحاظ سے سود کی تعریف یہ ہوئی کہ قرض میں دیئے ہوئے مال پر جو زائد رقم مدت کے مقابلہ میں شرط اور تعین کے ساتھ لی جائے وہ سود ہے گویا سودی معاملہ میں یہ تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔

(۱) اصل پر اضافہ۔

(۲) اضافہ کا تعین مدت کے لحاظ سے کیا جانا۔

(۳) معاملہ میں اس کا مشروط ہونا۔

قرض کا ہر وہ معاملہ جس میں یہ تین چیزیں پائی جائیں، سودی معاملہ ہے اور ایسا شریعت میں حرام ہے خواہ قرض کسی پیداواری کام میں لگانے کے لیے لیا گیا ہو یا ذاتی ضرورت کے لیے اور قرض لینے والا امیر ہو یا غریب۔

اس لحاظ سے تجارت اور سود میں اصولی فرق علماء نے یہ لکھا ہے کہ

(۱) تجارت میں فروخت کنندہ اور خریدار کے درمیان منافع کا مبادلہ برابری کی بنیاد پر ہوتا ہے کیونکہ خریدنے والا اس شے سے نفع حاصل کرتا ہے جو اس نے فروخت کرنے والے سے خریدی ہے اس کے برعکس سودی معاملہ میں سود لینے والا رقم مال کی ایک مقررہ مقدار لے لیتا ہے جو اس کے لیے یقینی طور پر منافع بخش ہے لیکن اس کے مقابلہ میں سود دینے والے کے لیے منافع یقینی نہیں ہے کیونکہ اس نے اگر قرض ذاتی ضرورت کے لیے لیا ہے تو یقینی طور پر سود اس کے لیے نقصان دہ ہے اور اگر صنعت و تجارت یا کاروبار اور زراعت کے لیے قرض لیا ہے تو بھی نفع یقینی نہیں نقصان کا بھی اتنا ہی امکان موجود ہے جتنا نفع کا گویا ایک فریق کا منافع تو یقینی ہے اور دوسرے کا مشکوک اور موہوم۔

(۲) تجارت میں چیز اور اس کی قیمت کا مبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے جبکہ سودی معاملہ میں قرض لینے والا مال کو خرچ کر لیتا ہے اور پھر یہ مال دوبارہ حاصل کر کے سود یا اضافہ کے ساتھ واپس کرتا ہے۔

(۳) تجارت میں فروخت کنندہ خریدار سے خواہ کتنا ہی منافع کیوں نہ لے وہ صرف ایک ہی مرتبہ لیتا ہے لیکن سودی معاملہ میں رقم لینے والا مسلسل اپنے مال پر منافع وصول

کرتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس پر اضافہ اور بڑھوتری ہوتی رہتی ہے۔

(۴) تجارت میں انسان اپنی محنت اور ذہانت صرف کر کے اس کا فائدہ حاصل کرتا ہے جب کہ سودی کاروبار میں صرف زائد از ضرورت مال دے کر فائدہ حاصل کیا جاتا ہے یعنی سودی کاروبار ایسا شراکتی کاروبار ہے جس میں ایک فریق صرف اپنا مال دے کر ایک مقررہ اور مشروط منافع کا شریک بن جاتا ہے۔

یہ ساری باتیں ہمیں آج کل کے تاجروں سے نہیں ملتی ہیں اور یہی ان لوگوں کے ذہنوں میں کھٹکتی ہیں جن پر مغربی تہذیب کا بھوت سوار ہے۔ چنانچہ وہ سود کے جواز پر مختلف دلائل پیش کرتے ہیں۔ گویا یہ وقت کی ناگزیر ضرورت ہے جس کو قرآن حکیم نے صریح طور پر حرام قرار دیا ہے۔ مسلمان اس کے جواز کے لیے اخبارات میں غلط قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں۔ سود کے جواز کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ سرمایہ (Capital) چونکہ ایک عامل پیدائش ہے اور باقی عاملین پیدائش کے ساتھ مل کر پیدائش دولت کے عمل میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے یہ اپنا معاوضہ سود کی صورت میں وصول کرتا ہے جب کہ باقی عاملین پیدائش یعنی زمین، محنت اور تنظیم اپنا اپنا معاوضہ بالترتیب لگان، اجرت اور منافع کی شکل میں وصول کرتے ہیں تو آخر سرمایہ کو سود کیوں نہ دیا جائے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں عاملین پیدائش چار سمجھے جاتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

نمبر	عامل	معاوضہ
۱	زمین	لگان
۲	محنت	اجرت
۳	سرمایہ	سود
۴	تنظیم	منافع

کاروباری صورتوں میں اکثر یہ مشترکہ شراکتی بنیادوں پر کاروبار چلتا ہے جس میں حصہ دار مشترکہ طور پر سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور اس طریقے سے کاروبار میں شراکت اختیار کرتے ہیں۔ اس سرمایہ سے جو ان حصہ داروں نے فراہم کیا ہے، منتظم اپنی ذہنی صلاحیت کو استعمال کرکے کاروبار چلاتا ہے۔ اور اپنی اس جدوجہد اور کاوش کا معاوضہ مقرر کردہ تنخواہ کی صورت میں کمپنی سے وصول کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ منتظم کی حیثیت ایک الگ عامل پیدائش کی نہیں بلکہ اس کا تعلق محنت سے ہے اور وہ اجرت وصول کرتا ہے کیونکہ محنت بطور عامل پیدائش ذہنی یا جسمانی کاوش اور جدوجہد کا نام ہے اور اس کا معاوضہ اجرت کی شکل میں ادا کیا جاتا ہے اور جہاں تک عامل پیدائش کے طور پر سرمایہ کا تعلق ہے تو سرمایہ فراہم کرنے والا حصہ دار (Share-holder) دراصل نفع نقصان کی ذمہ داری اٹھاتا ہے اور نفع یا نقصان کا حق دار ہوتا ہے کاروبار کے تمام حصہ دار (Share-holder's) اسی حیثیت سے کاروبار میں شریک ہوتے ہیں کیونکہ نفع کی صورت میں ان کو نفع اور نقصان کی صورت میں نقصان اٹھانا پڑتا ہے گویا سرمایہ پیدائش دولت کے عمل میں خطرہ مول لیتا ہے اور معاوضے کے طور پر نفع یا نقصان اٹھاتا ہے۔ لہٰذا سرمایہ میں سود کی ادائیگی کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا کیونکہ عاملین پیدائش درحقیقت تین ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں عاملین پیدائش کی تعداد چار تسلیم کی جاتی ہے۔ زمین، محنت، سرمایہ اور منتظم۔ اشتراکی ماہرین معیشت زمین اور محنت ہی کو پیدائش کے عوامل کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں منتظم محنت ہی کی ایک شکل ہے جبکہ سرمایہ کی حیثیت ذخیرہ شدہ محنت (Stored Labour) کی ہے۔ سرمایہ ماضی کی محنت کا وہ ذخیرہ ہے جسے خرچ کرنے کے بجائے ذخیرہ کر لیا گیا تھا۔ اسلامی معاشیات کے بعض ماہرین کے نزدیک عاملین پیدائش تین ہیں۔ زمین، محنت اور سرمایہ۔ زمین ان تمام وسائل پر مشتمل ہے جو قدرتی ہیں۔ محنت انسانی کاوش اور جدوجہد کا نام ہے جس میں جسمانی مشقت کے ساتھ تنظیمی کام بھی شامل ہے اور کاروبار کے نفع و نقصان کا ذمہ دار ہے۔

حواس باختہ کر دیا ہو، یہ اس لیے ہوگا کہ انہوں نے کہا کہ خرید و فروخت (بیع) بھی سود کی طرح ہے حالانکہ خرید و فروخت کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام، لہٰذا جس کو بھی اس کے پروردگار کی یہ نصیحت پہنچ گئی اور وہ آئندہ سود لینے سے باز آگیا تو جو کچھ پہلے لے چکا وہ اسی کا ہو چکا اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو شخص پھر سود لے گا وہ جہنمی گروہ میں سے ہے ہمیشہ عذاب میں رہنے والا۔ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور یاد رکھو! اللہ ناسپاس اور نافرمان سے خوش نہیں ہے۔"

اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے بعض خاص چیزوں کے بارہ میں وضاحت فرمائی۔ اب تک تو مالیاتی مسائل کے ضمن میں صدقات، خیرات، ان کے فضائل اور ان کی شرائط و قیود کی نشان دہی فرمائی۔ صدقات اگر ایک طرف مالیاتی زندگی کو آسان تر بناتے ہیں تو دوسری طرف معاشرتی گناہوں کی تطہیر کا سامان کرتے ہیں۔ صدقات کے ذریعہ انسان میں اخلاق، مروت، خیراندیشی اور رفاہ عامہ کے لئے خیرسگالی کے جذبات کی تربیت ہوتی ہے اس کے برعکس سود میں کمینہ پن، بے مروتی، ضرر رسانی اور ظلم و استبداد کی روح کارفرما ہوتی ہے۔ اسی لیے یہاں صدقات کے بعد سود کا تذکرہ فرمایا ہے اور بتادیا ہے کہ صدقات میں جس قدر خیر ہے سود میں اتنی ہی برائی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی استعداد کی نشوونما تب پاسکتی ہے اگر اس کا گلا دبانے والی ان باتوں سے تدارک ہو جائے جو اس کی ضد ہیں اس لیے انفاق فی سبیل اللہ کے حکم کے ساتھ ہی سود کی ممانعت کر دی گئی جو اس کی ضد ہے۔

صدقات انسان میں دوسروں کی خیر خواہی، خیراندیشی اور رفاہ عامہ کی ہمدردی کے جذبات پیدا کرتے ہیں اور سود اس کے بالکل الٹ شقاوت قلبی اور بداندیشی کے جذبات پیدا کرتا ہے گویا سود صدقہ کی بالکل ضد ہے۔ صدقہ کی محرک بلند ہمتی، ہمدردی، فیاضی، ایثار اور رحم دلی ہے اور سود کا محرک بزدلی، خود غرضی، تنگ دلی اور دوسروں کی

مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی خواہش ہے۔ صدقہ ضرورت مندوں کو سہارا دیتا ہے اور سود کرنے والوں کو اور زیادہ تنگی میں گراتا ہے اور پھر ان کا خون چوستا ہے۔ چنانچہ صدقات کے بعد سود کا ذکر کیا گیا۔

دوسری بات جو اس آیت میں قرآنی وہ یہ ہے کہ "وہ کھڑے نہ ہوں گے مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان کی چھوت نے حواس باختہ اور باؤلا کردیا ہو" جمہور مفسرین قرآن کے خیال میں کھڑے ہونے سے مراد قیامت میں اٹھنا ہے اور مطلب یہ ہے کہ سود کھانے والے قیامت کے روز قبروں سے ایسے اٹھیں گے جیسے آسیب زدہ اور مجنون، آخرت میں اپنی قبروں سے اٹھنے پر یہ سود خور سیدھے کھڑے نہ ہو سکیں گے۔ کھڑے ہوں گے بھی تو بیٹھوں جیسے لولوں اور دیوانوں کی طرح گرتے پڑتے اور لڑکھڑاتے ہوئے۔ ان کا ایک ہلکا سا رنگ اسی دنیا میں بھی نظر آتا ہے کہ ایک ساہوکار جو روپے کے پیچھے دیوانہ اور باؤلا ہو جاتا ہے۔ اس کو دیکھ کر حقیقتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو جن بھوت چمٹ گیا ہے۔ اس کے ذہن پر ہر لحظہ اور ہر وقت سود کا بھوت سوار رہتا ہے۔ لہٰذا قیامت میں بھی اس کا حشر آسیب زدہ و مجنون شخص کی طرح ہوگا۔ سیدنا عوف بن مالک کی طبرانی کی روایت میں مرفوعاً آیا ہے کہ سود خور قیامت کے روز خبطی اور مجنون بن کر کھڑا ہوگا۔ بعض روایات میں سود خور کا خون کی نہر میں غوطہ کھانا بھی مروی ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ دنیا میں غریب کا خون چوستا تھا اس لیے سزا بھی اسی قسم کی تجویز کی گئی۔

اس آیت میں تیسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ جاہلی عربوں نے کہا کہ خرید و فروخت بھی سود کی طرح ہے۔ یہ حالت اس لیے ہوئی کہ انہوں نے حلال و حرام کو یکساں کردیا اور صرف اس وجہ سے کہ دونوں میں نفع مقصود ہوتا ہے۔ دونوں کو حلال کہا حالانکہ بیع اور ربا میں بڑا فرق ہے۔ بیع کو اللہ تعالیٰ نے حلال کہا ہے اور سود کو حرام۔ بیع میں تو نفع ہوتا ہے وہ مال کے مقابلے میں ہوتا ہے جیسا کہ کسی نے ایک روپے کی قیمت کا کپڑا دو روپے میں فروخت کیا اور سود وہ ہوتا ہے جس میں نفع بلا عوض ہو۔ ایک روپے کے بدلے دو روپے لے، پہلی صورت میں چونکہ کپڑا اور روپیہ دو جدا جدا قسمیں ہیں اور نفع اور عوض بر

احتیاج میں ہے۔ بہرحال ان لوگوں نے فقط اس وجہ سے کہ دونوں میں فائدہ اور نفع مقصود ہوتا ہے دونوں کو یکساں سمجھ لیا حالانکہ بیع اور ربا میں بڑا فرق ہے۔ (معارف القرآن مولانا محمد ادریس)

آج کل کے روشن خیالوں اور مغرب زدہ جدید ذہن رکھنے والوں کی طرح زمانہ جاہلیت کے احمقوں، بیوقوفوں اور جاہلوں کا بھی یہ کہنا تھا کہ جب نفع تجارت میں بھی ہوتا ہے، پھر جب تجارت حرام نہیں تو سود کیوں حرام ہے؟ ان کے اس نظریہ کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ تجارت کی ذہنیت اور سود کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور دونوں کو ایک ہی قسم کی چیز سمجھ کر یوں استدلال کرتے ہیں کہ جب تجارت میں لگے ہوئے مال کا منافع جائز ہے تو قرض پر دیے گئے روپیہ کا منافع کیوں ناجائز ہے؟ اسی قسم کے دلائل موجودہ زمانے کے سود خور بھی سود کے حق میں پیش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص جس روپیہ سے خود فائدہ اٹھا سکتا ہے اسے وہ قرض پر دوسرے شخص کے حوالے کرتا ہے وہ دوسرا شخص بھی بہرحال اس سے فائدہ ہی اٹھاتا ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ قرض دینے والے کے روپیہ سے جو فائدہ قرض لینے والا اٹھا رہا ہے اس میں سے ایک حصہ وہ قرض دینے والے کو ادا نہ کرے لیکن یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ دنیا میں جتنے کاروبار ہیں خواہ وہ تجارت کے ہوں یا صنعت وحرفت کے یا زراعت کے، اور خواہ انہیں آدمی محنت سے کرتا ہو یا اپنے سرمایہ اور محنت دونوں سے، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں آدمی نقصان کا خطرہ (Risk) مول نہ لیتا ہو اور جس میں آدمی کے لیے لازماً ایک مقررہ منافع کی ضمانت ہو۔ پھر آخر پوری کاروباری دنیا میں ایک قرض دینے والا سرمایہ دار ہی کیوں ہے جو نقصان کے خطرہ (Risk) سے بچ کر ایک مقرر اور لازمی منافع کا حقدار ہو۔ (تفہیم القرآن)

پھر اس بات پر بھی غور فرمائیے کہ تجارت میں نفع ونقصان دونوں کا احتمال ہر وقت لگا رہتا ہے اور تاجر کو نقصان سے بچنے کیلئے وقت، محنت اور ذہانت سب کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ پھر تجارتی معاملہ تو ہر وقت ختم ہو جاتا ہے برخلاف اس کی مدت اور مہلت کے ساتھ ساتھ سود خور کے مطالبات کی میزان بھی بڑھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اکثر اوقات قرض دار تباہی اور بربادی کے کنارے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

میں بھی نفع اٹھاتا ہے تو کبھی نقصان ہو اس نقصان کا مقابلہ کرتا ہے جس پر نقصان کے سارے دروازے بند ہوں اور صرف نفع ہو اور نفع بھی اضعافاً مضاعفہ دو گنے چوگنے کے حساب سے۔ کیا یہ دونوں برابر ہیں؟

ملک کی اکثریت جب ان سود خوروں سے تنگ آجاتی ہے تو اس کے نتیجے میں سلطنتیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں اس کا امن غارت ہو جاتا ہے اور غریب بھوکے اور غضب ناک بھیڑیوں کی طرح دولت مندوں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ مورخین نے اس بات کو کئی مرتبہ دہرایا اور اشتراکیت بھی اسی کا نتیجہ ہے۔ بقول علامہ مناظر احسن گیلانی قدس سرہ کے کوئی تعمیری نہیں بلکہ ایک انتقام ہے جو غریبوں نے امیروں سے لیا۔ جب سودی نظام دنیا کی سرکاری طور پر اجازت ہوگی تو سرمایہ داروں کا طبقہ ملک کے اکثر افراد کیلئے شدید معاشی ضرر کا باعث ہو جائے گا۔ یہ سب آپ مشاہدہ کر رہے ہیں کہ آپ کو ساری دنیا میں ظلم برپا دکھتا ہے۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ چند ساہوکاروں اور پیشہ ور سود خوروں ہی کو اس سودی کاروبار کی اجازت دے رکھی ہے بلکہ بینکنگ سسٹم رائج کر کے سود خوروں کو کھلے ہو کر غریبوں کا خون چوسنے کا موقع فراہم کیا۔ سودی کاروبار کو اختیار کر کے اس نے قدرت سے جنگ کا اعلان کر دیا۔ ان سود کے چلتے پرزے ملک میں گرانی کا باعث بنتے ہیں غریب طبقوں کو مار رہے ہیں۔ ماہرین کا بیان ہے کہ سود پر اساسی ضرورتوں کو اگر روپیہ قرض نہ ملتا تو روزانہ کروڑ روپے کی رقم کی فراہمی کا قطعاً امکان نہ تھا۔ گویا آج سودی اعلان جنگ دراصل بجائے خود جنگ کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ انسانوں کی کمائی ہوئی آمدنی دھواں بن کر کچھ تو ہواؤں میں جہازوں کی شکل میں اور کچھ مختلف بموں، گولوں اور بموں وغیرہ کی شکل میں برباد ہو رہی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سود خواہ مفرد ہو یا مرکب اسلام میں اسی طرح دونوں حرام ہیں جیسے کہ شراب اور خنزیر وغیرہ کہ کوئی رنگ ہو اسلام میں وہ حرام ہے ایسے ہی سود کی کوئی شکل ہو مرکب ہو یا مفرد اسلام نے اسے ممنوع قرار دے کر معاشی زندگی کے ایک بہت بڑے مفسدہ کو جڑ سے اکھاڑ دیا ہے۔ سود کی وجہ سے سرمایہ داروں اور ان کے اداروں (بینکوں)

کیلئے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ غریبوں کا خون چوسیں اور ان کی خون پسینہ کی کمائی سے اپنی دولت میں اضافہ کریں۔ سود سے کئی معاشی امراض پیدا ہوتے ہیں جو کسی بھی ملک کے جسم میں سرطان کا کام دیتے ہیں۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم بھی اسی کی وجہ ہے۔ ارتکاز اور ارتکازِ دولت بھی اسی کے سبب سے ہے۔

مختصر یہ کہ اسلامی احکام کی رو سے ہر قسم کا سود قطعاً ناجائز اور حرام ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ معاشی دور کا کاروباری سود اور چیز ہے وہ شاید اس بات کو بھی جانتے ہیں کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ہی سود ہے اور اگر آپ حقیقی سود کو ممنوع قرار دے دیں تو یہ نظام اپنی موجودہ شکل میں باقی نہیں رہ سکتا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ بڑے کاروبار کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنا بغیر سود کے ممکن نہیں۔ ان کا یہ اعتراض اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا۔ حقیقت اس کے خلاف ہے اگر سود کو ختم کر کے اس کی جگہ منافع کی بنیاد پر معاشی نظام استوار کیا جائے تو موجودہ زمانہ کی بہت سی معاشی خرابیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

سود کی وجہ سے روپیہ لگانے والوں کو معاشی اور تجارتی کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ انہیں تو سال کے اختتام پر سود کی وصولی سے مطلب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آنکھ بند کر کے اپنا روپیہ بینکوں کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن بینکوں کی پالیسی پر انہیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ نہ تو بینک کی کارروائیوں پر انہیں تنقید یا نکتہ چینی کا کوئی حق ہوتا ہے اور نہ ہی ان کا کوئی نمائندہ بینک کے معاملات میں اپنی کوئی آواز رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بینک کا پورا کاروبار بڑے سرمایہ داروں کے مفاد اور اغراض کا تابع ہو کر رہ جاتا ہے جس کے نتیجہ میں ساری تجارت، ساری صنعت اور سارے مالی ذرائع پر بھی چند سرمایہ دار جماعت کا قبضہ رہتا ہے کیونکہ بینکنگ نظام تجارت و صنعت کی بنیاد ہے۔ کوئی صنعت اور کوئی تجارت بینکوں کے مالی تعاون کے بغیر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتی اور مالی نظام جس طبقے کے ہاتھ میں ہوگا تجارت و صنعت پر بھی اسی کا قبضہ ہوگا۔ اسی صورت حال سے متاثر ہو کر ایک انگریز مصنف نے بطور طنز لکھا ہے کہ "بینک آف انگلینڈ کا صدر تاجداروں سے کئی گنا زیادہ اقتدار اور اختیار کا مالک ہوتا ہے۔" یہ استعارہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

پیٹ ایسے تھے جیسے اژدہوں سے بھرے ہوئے گھر، اور اژدہے پیٹوں سے باہر بھی دکھائی دیتے تھے۔ میں نے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ جبرائیل نے جواب دیا: یہ سود خور ہیں۔" [ھولاء أكلة الربا]

[ابن ماجہ حدیث نمبر ۲۲۷۳، مسند احمد جلد ۲ ص ۳۵۳، ۳۶۳، مجمع الزوائد جلد ۳ ص ۳۲۸]

(۴) سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جو سود نہ کھائے گا اور اگر کوئی نہیں کھائے گا تو اس کو اس کا غبار ضرور پہنچے گا۔" [ابن ماجہ نمبر ۲۲۷۸، ابواب التجارات، سنن کبریٰ بیہقی جلد ۵ ص ۲۷۵، شرح السنۃ بغوی جلد ۸ ص ۵۵، مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۱۱، مسند احمد جلد ۲ ص ۴۹۴، مسند ابی یعلیٰ جلد ۱۱ ص ۱۰۵]

(۵) سیدنا ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"سونے کو سونے کے عوض صرف برابر برابر فروخت کرو اور بعض سونے کے عوض کم سوا مت فروخت کرو، اور چاندی کو چاندی کے عوض صرف برابر برابر فروخت کرو اور بعض چاندی کو کم چاندی کے عوض مت فروخت کرو اور ان میں سے کسی کو ادھار مت فروخت کرو۔" [مسلم نمبر ۱۵۸۴]

(۶) سیدنا عبادہ بن صامتؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"سونے کی بیع سونے کے عوض اور چاندی کی بیع چاندی کے عوض، گندم کی بیع گندم کے عوض اور جو کی بیع جو کے عوض اور کھجور کی بیع کھجور کے عوض اور نمک کی بیع نمک کے عوض برابر سرابر اور نقد بہ نقد ہو اور جب یہ اقسام مختلف ہو جائیں تو پھر جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ نقد بہ نقد ہو۔" [مسلم حدیث نمبر ۱۵۸۷]

(۷) سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ برنی کھجوریں لے کر آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا یہ کھجوریں کہاں سے لائے ہو؟ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، میرے پاس ردی قسم کی کھجوریں تھیں میں نے ان میں سے دو صاع فروخت کر کے اس کے عوض ایک صاع کھجوریں لی ہیں تاکہ رسول اللہ ﷺ کے کھانے کے لیے پیش کی جائیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اوہ! یہ تو عین سود ہے ایسا نہ کرو لیکن جب تم کھجور خریدنا چاہو تو اپنی کھجوریں فروخت کرو پھر اس قیمت سے دوسری کھجوریں خرید لو۔" (مسلم، حدیث نمبر ۴۰۸۳)

شریعت میں ربا کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ربا النسیئہ اسے ربا القرآن بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کو قرآن نے حرام کیا ہے۔

(۲) ربا الفضل اسے ربا الحدیث بھی کہتے ہیں اور ربا الفضل یہ ہے کہ ایک جنس کی چیز دست بدست کمی بیشی کے عوض بیچی جائے مثلاً پانچ کلو گندم کو چھ کلو گندم کے عوض فروخت کیا جائے۔ ربا الفضل کن چیزوں میں ہے اس میں آئمہ کا اختلاف ہے۔

ربا النسیئہ یہ ہے کہ ادھار کی میعاد پر متعین شرح کے ساتھ اصل رقم سے زیادہ وصول کرنا یا اس پر نفع وصول کرنا۔ موجودہ زمانہ میں جو سود رائج ہے اس پر بھی سود کی یہ تعریف صادق آتی ہے۔

ربا النسیئہ کی تعریف امام فخر الدین رازی نے یہ کی ہے فرماتے ہیں

"ربا النسیئہ زمانہ جاہلیت میں مشہور و معروف تھا۔ لوگ اس طرح پر قرض دیتے تھے کہ وہ اس کے عوض ہر ماہ (یا ہر سال) ایک متعین رقم لیا کرتے تھے۔ اور اصل رقم مقروض کے ذمہ باقی رہتی تھی۔ مدت پوری ہونے کے بعد قرض خواہ مقروض سے اصل رقم کا مطالبہ کرتا اور اگر مقروض اصل رقم ادا نہ کر سکتا تو قرض خواہ مدت اور سود دونوں میں اضافہ کر دیتا یہی وہ ربا ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا۔"

(تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۸۱ بیروت)

علامہ ابوالولید باجی نے ربا النسیہ کی تعریف میں لکھا ہے۔

''ربا جاہلیت کا یہ ہے کہ مدت پوری ہونے کے بعد قرض خواہ مقروض سے کہے کہ تم قرض ادا کرتے ہو یا میں سود کے عوض مدت میں اضافہ کر دوں؟ اگر مقروض سود نہ دیتا تو قرض خواہ مدت میں اضافہ کر دیتا۔ اس کے حرام ہونے میں مسلمانوں کا کوئی اختلاف نہیں۔ (وهذا مما لا خلاف بين المسلمين في تحريمه)'' (المنتقی جلد ۵ ص ۶۵ ابوالولید باجی مالکی)

یہ تو تھی ربا النسیہ کی تعریف اور ربا الفضل یہ ہے کہ ایک مخصوص مال کو اس کی شکل کے بدلے بقدر زیادتی کے ساتھ یا ادھار فروخت کیا جائے مثلاً ایک کلو گندم کو دو کلو گندم کے عوض نقد فروخت کیا جائے یا پانچ کلو گندم کو پانچ کلو گندم کے عوض ایک سال کے ادھار پر فروخت کیا جائے۔ یہ ربا الفضل ہے اور اس کو ربا الحدیث بھی کہتے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث میں اس کو منع فرمایا ہے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے عوض، گندم گندم کے عوض، جو جو کے عوض، کھجور کھجور کے عوض اور نمک نمک کے عوض برابر سرابر اور نقد بہ نقد فروخت کرو اور جب یہ اجناس مختلف ہو جائیں تو پھر جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ نقد بہ نقد ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ جس نے زیادہ لیا یا زیادہ دیا اس نے سودی کاروبار کیا۔ دینے والا لینے والا دونوں برابر ہیں اور ایک اور روایت میں ہے کہ ایک دینار کو دو دیناروں کے بدلے میں اور ایک درہم کو دو درہم کے بدلے میں فروخت نہ کرو۔'' (مسلم جلد ۲ ص ۲۵-۲۶)

بعض علماء نے لکھا ہے کہ ربا الفضل اس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک ہی جنس کی دو چیزوں کے دست بدست لین دین میں ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ربا الفضل کو اس لیے حرام قرار دیا کہ اس سے ربا النسیہ کا دروازہ کھلتا ہے اور انسان میں وہ ذہنیت پرورش پاتی ہے جس کا آخری ثمر سود خوری ہے۔ یہ حکمت رسول اللہ ﷺ نے خود بیان فرمائی۔ سیدنا

(۲) معیادی امانتیں (Fixed Deposits)

(۳) بچت امانتیں (Saving Deposits)

بینک طلبی امانتوں پر سود ادا نہیں کرتا جب کہ معیادی اور بچت امانتوں پر سود ادا کرتا ہے۔

قرضوں کی درج ذیل تین اقسام ہیں

(۱) طلبی قرضے (Call Loans)

(۲) قلیل مدت کیلئے قرضے (Short-period Loans)

(۳) طویل مدت کیلئے قرضے (Long-period loans)

قرضوں کی ادائیگی کیلئے بینک درج ذیل طریقے اختیار کرتا ہے۔

(۱) اوورڈرافٹ (Overdraft) کے ذریعے۔

(۲) نقد قرضہ (Cash Credit)۔

(۳) ہنڈیوں کو بٹا کر (Through Discounting Bills)۔

(ج) ایجنسی کی خدمات، بینک اپنے گاہکوں کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اور مالی مشیر کے فرائض انجام دیتا ہے۔

(د) انتقال زر (Money Transfer) چیک، ورڈرافٹ کے ذریعہ اندرون ملک اور بیرون ملک رقوم کی منتقلی کا کام بھی بینک انجام دیتے ہے۔

(ہ) قیمتی اشیاء اور دستاویزات کی حفاظت (Safe Deposit Lockers)۔

(و) سرمایہ کاری (Investment) صنعتوں اور کمپنیوں کے حصص (Share) کی خریداری اور حکومتی کفالتوں (Securities) کی خریداری کے ذریعہ بینک سرمایہ کاری کرتے ہیں۔

(ز) زر اعتبار کی تخلیق (Credit Creation) تجارتی بینک قرضوں کے اجراء کے ذریعہ زر اعتبار پیدا کرتے ہیں۔

یہ ایک مختصر سا تعارف ہے جو بینک کا بیان دیا گیا ہے دور جدید کے یہ بینک بھی

سودی کاروبار کرتے ہیں لہٰذا یہ بھی حرمت سود کے تحت آجاتے ہیں۔ ظاہری طور پر بینک ایک خوش نما تجارتی ادارہ ہے لیکن اس میں ایک "مادیاتی" پوشیدہ ہے کیونکہ بینکوں کا وجود اس لیے ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے سرمایہ میں بے پناہ اضافہ ہو اور جس دولت و ثروت سے ذریعہ محنت کے اشتراک سے متوسط اور غریب طبقہ کے افراد کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے اس کا انسداد ہو جائے اور دولت سمٹ سمٹا کر ایک مخصوص اور محدود طبقہ میں محصور ہو جائے اور تمام تجارتی کاروبار کے نفع و نقصان کی قسمت چند بینک مالکان کے ہاتھوں میں مقید ہو کر رہ جائے اور اس طرح بینکوں کے سودی جال میں تجارت، زراعت اور مزدوری معاشرت پھنس کر رہ جائے جس کے نتیجہ میں دنیا دو حصوں میں منقسم ہو جائے ایک طرف بڑے بڑے قارون مثال سرمایہ دار ہوں جن کو آج کل کی اصطلاح میں Multi Billioners کہا جاتا ہے اور دوسری جانب کروڑوں بے شمار لوگ مفلس و نادار اور محتاج و قلاش جو بدن ڈھانپنے کیلئے کپڑا اور پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کیلئے روٹی تک نہ رکھتے ہوں اور سردی اور گرمی میں دو حیوانوں سے بدتر زندگی گزار کر اپنے اپنے کلبۂ احزان میں اور فٹ پاتھوں پر تڑپ تڑپ کر مرتے ہوں یا پھر سسک سسک کر اپنی زندگی کے ایام گزارنے کے عادی ہوں۔

بے شک یہ بینک بہت مفید اور موجودہ نظام معیشت کے لیے ضروری اور لازمی ہیں لیکن سرمایہ داروں اور مالداروں کیلئے نہ کہ غریبوں اور ناداروں کے لیے۔ یہ قارونی دولت کی کاشت کیلئے ایسے میدان ہیں اور غریبوں اور ناداروں کی لاشوں پر سرمایہ کی تعمیر کیلئے بہت عمدہ مسالہ اور سامان تعمیر۔ بینک نہایت خوبصورت طریقوں سے دولت کو دولت مندوں میں محدود کرتا اور عوام اور غرباء کی غربت کو دولت کے اور خوف کی وجہ میں پہنچا دیتا ہے۔ یہ تہذیب نو کا ایک تجارتی جال ہے جو امیروں کی بہتری کے ضروری اور عوام کی تباہی پر دولت مندی کی بنیادیں رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ زمانے کے کاروبار کو چلانے کیلئے بینک کا وجود نہایت ضروری ہے لیکن اس کی ایسی شکلیں بھی ممکن ہیں جو سود کے بغیر اس سسٹم کے مقصد کو

غریبوں سے سود لیتا تھا اور اس زمانے کی ترقی یافتہ بینکوں کے ذریعے غریبوں کو سود دیتی ہے۔ وہ ربا غریبوں پر ظلم تھا اور یہ ربا غریبوں کی خوشحالی اور ان کی مالی ترقی کا باعث ہے۔ اس لیے شخصی اور نجی ضروریات کے قرضوں پر سود ناجائز ہے بلکہ تجارتی قرضوں پر بینک کا سود جائز ہونا چاہیے۔

یہ دلیل بہت تو بڑی خوش آئند اور غریبوں کو خوش کرنے والی ہے لیکن اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بالکل بودی دلیل ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن حکیم میں مطلق سود حرام ہے خواہ ذاتی ضروریات کے قرضوں پر سود ہو یا تجارتی قرضوں پر ہو، خواہ اس سود سے غریبوں کو نقصان ہو یا فائدہ۔ اللہ تعالیٰ نے امارت و غربت کا فرق کیے بغیر سود کو علی الاطلاق حرام کیا ہے۔ سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۷۵، ۲۷۸، ۲۷۹ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے سود کو مطلقاً حرام کیا ہے۔ سود مفرد کو بھی حرام کیا اور سود مرکب کو بھی اور ہر جگہ سود کو مطلق حرام کیا اور نجی اور کاروباری قرضوں کا فرق نہیں کیا۔ علاوہ ازیں تاریخ اور حدیث سے ثابت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کاروباری قرضوں پر بھی سود لینے کا عام رواج تھا۔ چنانچہ علامہ ابن جریر طبری نے "وذروا ما بقي من الربوا" کی آیت کے تحت لکھا ہے۔

> "یہ وہ سود تھا جس کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں لوگ خرید و فروخت کرتے تھے۔ ایسا ہی علامہ سیوطی نے تفسیر درمنثور جلد ا ص ۳۶۶ پر لکھا ہے۔"

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے زمانہ جاہلیت میں بڑے بڑے تاجر خوردہ فروشوں کے ہاتھ ادھار مال فروخت کرتے تھے اور اس پر سود لیتے تھے۔ معلوم ہوا زمانہ جاہلیت میں بھی کاروباری اور تجارتی قرضوں پر سود لگانے کا عام رواج تھا اور قرآن حکیم نے عموم کے طریقے سے سود کی ممانعت کی ہے۔

یہ جدید مفکرین اس سلسلہ میں ایک اور دلیل پیش کرتے ہیں کہ بینک کے سود کے جائز ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ افراطِ زر کی وجہ سے روپے کی قدر (Value) روز بروز گرتی جا رہی ہے اور اجناس اور جائیداد کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔ آج سے ستر سال پہلے

سونا ۲۵ روپے تولہ تھا دیسی گھی تین روپے سیر تھا اسی طرح دوسری اشیاء بھی بہت سستی تھیں لیکن اب (2005ء) میں سونا دس ہزار روپے تولہ اور دیسی گھی ڈھائی سو روپیہ کلو ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر سال میں روپیہ کی قدر (Value) کتنی گھٹ گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے ستر سال قبل بینک میں ایک ہزار روپیہ جمع کرایا تھا اب اس کی قیمت پچاس روپے سے بھی کم ہو گئی ہے۔ اگر اسے ہزار پر ہر سال سود ملتا رہتا تو اس کی مالیت کسی حد تک بحال رہتی اور جو لوگ بینک میں اپنی بچتوں (Savings) کو جمع کراتے ہیں ان کا نقصان نہ ہوتا اس لیے بینک کا سود جائز ہونا چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بینک کے سود کو جائز قرار دینے کی بنا پر افراط زر کی وجہ سے روپیہ کی قدر گر جاتی ہے۔ اگر بینک سے سود نہ لیا جائے تو ستر سال میں بینک میں جمع کرائے ہوئے ایک ہزار روپے کی قیمت بہت کم رہ جائے گی۔ تو مسلمان ہونے کے ناطے اس دلیل کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ ایک مسلمان کے لیے اللہ کے حکم پر عمل کرنے اور اس کے منع کردہ کام سے بچنے کی وجہ سے اگر ہمیں کوئی مادی نقصان ہوتا ہے تو ہمیں اس کو خوشی گوارا کرنا چاہیے۔ مسلمان کے نزدیک نفع اور نقصان کا معیار دنیوی اور مادی اعتبار سے نہیں ہے بلکہ آخروی اور معنوی اعتبار سے ہے۔ دنیوی اور مادی اعتبار سے زکوۃ، قربانی اور حج وغیرہ کے لیے زر کثیر خرچ کرنا بھی مال کا ضیاع اور نقصان ہے تو کیا اس مادی نقطہ نظر سے ان تمام مالی عبادات وغیرہ کو ترک کر دیا جانا چاہیے؟ اور جب مسلمان مالی عبادات کو چھوڑنے پر تیار نہیں تو سود کھا کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اعلان جنگ کیسے تیار ہو سکتے ہیں؟ ایک سچے اور پکے مسلمان کے نزدیک سود چھوڑنے کی وجہ سے روپے کی قدر کا کم ہو جانا خسارہ نہیں ہے بلکہ اصل خسارہ یہ ہے کہ سود لینے کی وجہ سے آخرت برباد ہو جائے۔

دوسرا جواب اس بات کا یہ ہے کہ یہ نقصان درحقیقت ہماری ایک اجتماعی غلطی کی سزا ہے اور وہ یہ کہ ہم نے اسلامی طریقہ مضاربت کو رواج نہیں دیا اور اس سودی نظام نے قریباً تمام قوم کو حرص، لالچ اور بد دیانت بنا دیا ہے۔ اگر کوئی دیانتدار شخص اپنی تمام عمر کی پونجی کسی شخص کے ساتھ مضاربت میں لگاتا ہے تو دوسرا شخص اس کا تمام روپیہ ہضم کر جاتا ہے۔ اگر

بینک والے روپیہ مضاربت میں لگاتے تو بینک کا بھی فائدہ ہوتا اور مضارب کا بھی۔ لیکن بینک چونکہ ایک یہودیوں کا ایجاد کردہ ادارہ ہے جو اپنا روپیہ مضاربت کے بجائے مختلف کاروباروں میں سود کی شرح پر لگاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب لوگ بینکوں پر زور دے رہے ہیں کہ وہ اپنا روپیہ مضاربت پر لگایا کریں۔ دنیا میں اس وقت ستر (۷۰) کے قریب بینک اور مالیاتی ادارے ہیں جو غیر سودی بنیادوں پر کاروبار کرتے ہیں۔ بینک بھی زیادہ ترقی کر رہے ہیں اور لوگوں کو بھی بینکوں کے ذریعے مضاربت میں روپیہ لگانے سے زیادہ فائدہ ہو رہا ہے۔

سود کے مختلف مفاسد:

سود کے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور ہر طرح کی قسم کے بہت سے مفاسد ہیں۔ آپ اخلاقی اور روحانیت کے نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ اس کا اخلاق اور روح پر کیا اثر ہوتا ہے اور اگر کوئی شئے ہمارے اس جوہر کو نقصان پہنچائے تو وہ ہر حالت میں قابل ترک ہے خواہ کسی دوسرے پہلو سے اس میں کتنے ہی فوائد کیوں نہ ہوں۔ اب اگر آپ سود کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ روپیہ جمع کرنے کی خواہش سے لے کر سودی کاروبار کے مختلف مراحل تک پورا ذہنی عمل خود غرضی، حرص، بخل، تنگ دلی، سنگدلی اور زرپرستی جیسی صفات رذیلہ کے زیر اثر جاری رہتا ہے اور جتنا جتنا آدمی اس کاروبار میں آگے بڑھتا ہے یہی صفات رذیلہ اس کے اندر نشو و نما پاتی ہیں۔

تمدنی حیثیت سے ہلکی نظر ہی میں ایک شخص بخوبی جان سکتا ہے کہ جس معاشرے میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ خود غرضی کا معاملہ کریں۔ کوئی اپنی ذاتی غرض اور ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے ایک کی حاجت مندی دوسرے کے لیے نفع اندوزی کا موقع بن جائے اور مال دار طبقوں کا مفاد نادار اور حاجت مند طبقات کی ضد ہو جائے ایسا معاشرہ کبھی بھی مضبوط اور مستحکم نہیں ہو سکتا۔ اس کے اجزاء ہمیشہ انتشار و پراگندگی ہی کی طرف مائل رہیں گے اور اگر دوسرے اسباب بھی اس صورت حال کے لیے مددگار بن جائیں تو ایسے معاشرے کے اجزاء کا باہم متصادم ہو جانا بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس کے

برعکس جس معاشرے کا اجتماعی نظام آپس کی ہمدردی پر مبنی ہو، جس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی اور فراخ حوصلگی کا معاملہ کریں، جس میں ہر دوسرے شخص کی احتیاج کے موقع پر فراخ دلی کے ساتھ مدد کا ہاتھ بڑھایا جائے اور جس میں مال دار اور سرمایہ دار لوگ نادار اور حاجت مند لوگوں کے ساتھ ہمدردانہ اعانت یا کم از کم منصفانہ تعاون کا طریقہ برتیں، ایسے معاشرے میں آپس کی محبت اور خیر خواہی اور باہمی دلچسپی نشوونما پائے گی۔ اس کے اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ اور ایک دوسرے کے پشتیبان ہوں گے اس میں اندرونی نزاع اور تصادم کو راہ پانے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس میں باہمی تعاون اور خیر خواہی کی وجہ سے ترقی کی رفتار پہلے معاشرے کی بہ نسبت بہت زیادہ تیز ہوگی۔

ایسا ہی حال بین الاقوامی تعلقات کا بھی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ فیاضی اور ہمدردی کا معاملہ کرے اور اس کی مصیبت کے وقت کھلے دل سے تعاون کا ہاتھ بڑھائے ممکن نہیں ہے کہ دوسری طرف سے اس کا جواب محبت اور شکر گزاری اور مخلصانہ خیر خواہی کے سوا کسی اور صورت میں ملے۔ اس کے برعکس وہی قوم اگر اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ خود غرضی اور تنگ دلی کا برتاؤ کرے اور اس کی مشکلات کا ناجائز فائدہ اٹھائے تو یہ ہو سکتا ہے کہ مال کی صورت میں وہ بہت کچھ فائدہ اور نفع اس سے حاصل کرلے لیکن یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ پھر ایسے شائیلاک قسم کے ہمسایہ کے لیے اس قوم کے دل میں کوئی اخلاص، محبت، ہمدردی اور خیر خواہی رہ جائے۔

سود کے اگر معاشی پہلو پر نگاہ ڈالی جائے تو اس میں بھی بہت سے نقصانات مضمر ہیں۔ سود کا تعلق معاشی زندگی کے ان معاملات سے ہے جو صرف برصغیر پاک و ہند تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ایک عالمگیر ہے۔ یہ وہ بلائے عظیم اور وبائے بے درماں ہے جس میں ملک کی متوسط اور غریب طبقوں کی اکثریت بری طرح پھنسی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے قلیل المعاش کارکنوں کی آمدنی کا بڑا حصہ مہاجن لے جاتا ہے۔ شب و روز کی انتھک محنت اور مشقت کے بعد جو تھوڑی سی تنخواہ یا مزدوری ان کو ملتی ہے اس میں سے سود ادا کرنے کے بعد ان کے پاس اتنا بھی نہیں بچتا کہ وہ دو وقت کی روٹی چلا سکیں۔ یہ چیز صرف یہی نہیں

نے اپنی تفسیر کبیر میں بڑی تفصیل اور سیر حاصل بحث کی ہے، اہل علم ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ سود کے بارہ میں قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بھی اپنے ایک مکتوب میں بڑی پتے کی باتیں لکھی ہیں جو اہل علم کے پڑھنے کے قابل ہیں۔ خلاصہ ان سب حضرات کی تحریروں کا یہی ہے کہ سود جس کو زمانہ جاہلیت میں اور اس عہد جدید میں بھی معیشت کی ترقی کے لیے ضروری قرار دیا جاتا ہے اور سپریم کورٹ میں حکومت کے وکیل نے بھی یہ بیان دیا تھا کہ پاکستان کی معیشت کیلئے سود نہایت ضروری ہے، وہ اس کے بغیر نہیں چل سکتی، لیکن تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان جوشیلے مسلمانوں کی یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس سود نے آسٹریا کی معیشت کو تباہ کیا، ہنگری کی معیشت پر سود کے تباہ کن اثرات پڑے (ملاحظہ ہو لیڈ بینک، لندن کا رسالہ بابت مئی، جون ۱۹۳۸ء، نیویارک ٹائمز بابت ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ء) پھر بلغاریہ اور رومانیہ کی معیشت پر بھی اس کے نہایت تباہ کن اثرات پڑے (لندن ٹائمز بابت ۳۱ اگست ۱۹۳۳ء، ۱۱ اگست ۱۹۳۳ء، ڈیلی میل، یکم ستمبر ۱۹۳۳ء) سود جس معاشرہ میں بھی ہوگا وہاں دولت سمٹ سمٹا کر چند ہاتھوں میں جمع ہو جائے گی اور عوام کی حالت دن بدن بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔ اس سلسلہ میں مسٹر جافری ڈیلپ کا یہ کہنا بالکل درست اور صحیح ہے کہ ایسا معاشرہ جو اپنے بینکروں کے حقداروں میں ہو اور ان کی اخلاقی تلقین کا روادار ہو، باقی رہنے کے قابل نہیں معاشرہ کی خرابیوں کے ذمہ دار یہی بینک کار ہیں۔ یہ لوگ غریبوں کا استحصال کرتے ہیں اور چند ہاتھوں میں سرمایہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ چنانچہ پاکستان میں تجارتی بینکوں نے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۳ء ختم ہونے والے سال میں مجموعی طور پر ۷۰ ارب روپے منافع ظاہر کیا جو ۲۰۰۲ء میں ۱۹۹۶۳ ارب، سن ۲۰۰۴ء میں ۵۱.۱ ارب اور سن ۲۰۰۶ء میں ۸۵ ارب ہو گیا اور سن ۲۰۰۷ء میں یہ منافع سو ارب سے بھی بڑھ جائے گا۔ یہ سب رقم سودی نظام کے ذریعہ عوام کا خون چوس کر حاصل کی گئی ہے۔ اس بے مثال اضافہ کے باوجود کھاتے داروں کو دیے جانے والے منافع کی شرح میں مسلسل کمی ہو رہی ہے۔ اس طرح سادہ لوح عوام ایک طرف افراط زر اور دوسری طرف سودی استحصال کا شکار ہیں۔ مہنگائی و قیمتوں نے معاشرہ کے ہر فرد کو قرض میں جکڑ دیا ہے۔

حکومت مستحکم ہو رہی ہے اور عوام برباد ہو رہے ہیں۔

سود کے یہ مفاسد اور خرابیاں صرف افراد اور بڑی بڑی فیکٹریوں اور تجارتی کمپنیوں ہی تک محدود نہیں بلکہ بین الاقوامی بینکوں اور ورلڈ بینک سے جو ممالک اپنی نام نہاد ترقی کے لیے سود پر قرضے لیتے ہیں، وہ ان قرضوں میں اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ ساری زندگی ان قرضے کا سود ہی نہیں اتار سکتے بلکہ اکثر ملکوں کو جن میں پاکستان بھی شامل ہے، سود ادا کرنے کے لیے پھر قرضہ لینا پڑتا ہے اور ان کا اصل زر اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔

اس وقت دنیا میں دو بڑے ادارے مختلف ملکوں کو سود پر قرض دیتے ہیں۔ قریباً ایک سو اسی سے زائد ممالک کسی نہ کسی سطح پر ان دو اداروں (ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف) کے زیر اثر ہیں۔ یہ ادارے نہ صرف ملکوں کو کنٹرول کرتے ہیں بلکہ ان کی سیاست، معاشرت، کلچر، ثقافت اور ڈیموکریسی پر بھی حکومت کرتے ہیں۔ یہ جس ملک سے ناراض ہو جائیں یا اس ملک کے صاحبان اقتدار کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں تو وہ ملک ٹوٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ صرف انہی ملکوں کی صنعت و تجارت ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوتی ہے جس ملک کو یہ ترقی کی اجازت دیتے ہیں۔ جب یہ کسی سے خوش ہوتے ہیں تو اس کے لیے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیتے ہیں اور اگر ناراض ہوتے ہیں تو حکمرانوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ عوام کو مہنگائی کی چکی میں پیس کر رکھ دیں، ان کے لیے ضروریات زندگی ٹیکس لگا کر مہنگی کر دیں۔ بجلی، گیس اور پٹرول میں خاطر خواہ اضافہ کر دیں۔ اس مجبوری دور میں جب ضروریات زندگی گراں اور مہنگی ہوتی ہیں تو عوام جلسوں اور جلوسوں کی شکل میں حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکمران مسند اقتدار سے جلد فارغ ہو کر گھر جا بیٹھتا ہے یا انکار کرتا ہے تو اسے "دیوالیہ" ہونے کی خوشخبری سنا دی جاتی ہے۔ اس کے لیے "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" والا معاملہ ہو جاتا ہے۔

آئی ایم ایف (انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ) کو یہ ادارہ ۱۹۴۵ء میں جنگ عظیم دوم کے ختم ہونے کے بعد وجود میں آیا لیکن جلد ہی اس نے دنیا کے ۱۸۳ ملکوں کو اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ لیا۔ آئی ایم ایف کے تین مقاصد ہیں۔

(۱) عالمی تجارت میں توازن پیدا کرنا

(۲) مختلف ممالک کی کرنسیوں کی شرح تبادلہ طے کرنا

(۳) کرنسیوں کی قیمت کرنے پر نظر رکھنا

ان تین مقاصد کے باعث اس نے دنیا کی اقتصادیات پر مکمل طور پر قبضہ کرلیا کیوں کہ جب کوئی ملک آئی ایم ایف کا ممبر بنتا ہے تو دستخط کرنے کے بعد اس ملک کی تجارت، اس کی کرنسی کی شرح تبادلہ آئی ایم ایف کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ تب اس ملک کا بجٹ، اس کی معاشی پالیسیاں، اس کی صنعت، اس کا ٹیکس سسٹم اور اس ملک کی سیاست پر آئی ایم ایف کا اثر اندازہونا اس کا استحقاق ہوجاتا ہے۔ اب یہ مالیاتی ادارہ اس ملک کی دولت، اس کے مالیاتی ذخائر، قرضوں کی ترسیل، ایکسچینج ریٹ، صنعت وحرفت، بینکوں، معاشی قوانین اور ملکی پالیسیوں کی نگرانی کرتا ہے۔ کوئی رکن ملک اس کی اجازت کے بغیر کسی قسم کا معاشی ردوبدل نہیں کرسکتا کیوں کہ آئی ایم ایف کے ملازمین تمام ممبر ملکوں کی وزارت خزانہ میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ تمام سرکاری کاغذات ان کے ہاتھوں سے نکل کر دوسری جگہ جاتے ہیں۔ اگر اس ملک کا کوئی فرد کوئی ایسی اصلاح کرتا ہے جس سے بین الاقوامی تجارت یا عالمی تجارت متاثر ہوتی ہے تو فوراً اس کی اطلاع واشنگٹن کردی جاتی ہے، اور پھر وہاں سے ایک ایسا ٹیلی فون آتا ہے جس سے وہ اصلاح واپس لے لی جاتی ہے یا اس میں واشنگٹن کی مرضی کے مطابق ترمیم کردی جاتی ہے۔

آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی ساٹھ سالہ تاریخ میں ایک بھی ملک ایسا نہیں جس نے ایک بار ان سے سودی قرض لیا ہو اور اس کے بعد اس سے اس کی جان مکمل طور پر چھوٹ گئی ہو۔ یہ آکٹوپس (Octopus) کی طرح اس ملک کو اپنی ٹانگوں میں اس طرح پھنساتا ہے کہ وہ ملک اپنی تمام طاقت کے باوجود اس کے آہنی پنجوں اور مضبوط گرفت سے نہیں نکل سکتا۔

پاکستان کے ذمہ صرف چار اداروں پی سی ایل، آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور اے ڈی بی کا ۲۲ ہزار تین سو ۹۴ ملین ڈالر قرضہ ہے جو ۲۲ ارب تین سو نوے ملین ڈالر بنتے ہیں۔

اس سال پانچ ارب ڈالر میں تین بڑے بنکوں کے ہم نے چھ ہزار ۱۳ ملین ڈالر اور ۱۹ ملین ڈالر بیرون ملک یورو بونڈز کی شکل میں ہیں۔ ۲ ہزار ۵۰ ملین تجارتی قرضے ہیں جب کہ ۱۵ ہزار ۲ ملین ڈالر ذخیرہ کرنسی وصول کرتے ہیں۔ ہم ہر سال ایک ہزار آٹھ سو ۳۳ ملین ڈالر کی قسط ادا کرتے ہیں۔ اس میں سے ہم بنکوں کو ایک ہزار چار سو ۱۲ ملین ڈالر دیتے ہیں۔ مجموعی طور آئی ایم ایف میں ۳۰ ہزار ۲۷ ملین ڈالر ہمارے ذمہ ہیں جب کہ ہمارے مالیاتی ذخائر (مارچ ۲۰۰۲ء) تین ہزار ۵۹۶ ملین ڈالر ہیں۔ ہم اگر بیرونی مجموعی اعداد و شمار کو جمع کریں تو ہمارا قرضہ ۳۴ بلین ۸۹۵ ملین ڈالر بنتا ہے۔ ان میں سے اگر ہم ذخائر نکال دیں تو ۳۶ بلین اور سو ملین ڈالر بچتے ہیں، جو ظاہر ہے کہ ہمارے جیسے ملک کے لیے ادا کرنا ممکن نہیں۔ جتنا ہمارا قرضہ ہے اس سے کئی گنا زیادہ ہم آج تک سود کی شکل میں ادا کر چکے ہیں لیکن ہمارا قرضہ وہیں کا وہیں ہے، ہم جو کچھ ہر سال دیتے ہیں وہ سود میں کٹتا ہے۔

آج دنیا میں روپے کے دریا بہہ رہے ہیں۔ اتنی دولت اس سے قبل کبھی نہیں ہوئی تھی۔ زمین نے اپنے خزانے باہر اگل دیے ہیں۔ (و اخرجت الارض اثقالها) لیکن اس کے باوجود ہر شخص بے چین اور بے سکون ہے۔ حرص و ہوس دل میں گھر کیے ہوئے ہے۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ دنیا کے ۱۸۳ ملکوں کے عوام کی خون پسینے کی کمائی سود میں دی جا رہی ہے اور قرضہ ہے کہ شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہ ساری بے چینی اسی سود کی وجہ سے ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا اور عوام کا خون چوس چوس کر بڑے بڑے سرمایہ داروں کی توندوں کو موٹا کر رہا ہے۔

شریعت اسلامیہ نے اسی وجہ سے نہایت سختی کے ساتھ سود کو حرام قرار دیا کیوں کہ یہ جس فرد یا ملک کو چمٹ جائے اس کو کسی صورت نہیں چھوڑتا اور وہ فرد یا ملک قرض دینے والے کا سدا غلام بن جاتا ہے۔ وہ قومیں کبھی بھی ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتیں جن میں سود کا چلن ہو۔ کہا جاتا ہے اور بالکل درست کہا جاتا ہے کہ "کاشت کار مقروض پیدا ہوتا ہے، مقروض زندہ رہتا ہے اور مقروض ہی مرتا ہے۔"

جب کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ سود سرمایہ دارانہ نظام کا ایک نہایت اہم

ہے۔ دنیا کے دس امیر ترین اشخاص میں بل گیٹس پہلے نمبر پر، وارن بفے دوسرے، ہندوستان کے لکشمی متل تیسرے نمبر پر اور سعودی عرب کے ولید طلال پانچویں نمبر پر ہیں۔

امریکہ میں شائع ہونے والی ایک کتاب The Bush Agenda کے مطابق پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کا تسلسل اور وقت امریکہ کے مفاد میں ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ صدر بش کی پالیسیوں کی وجہ سے امریکہ کی ۲۹ بڑی تیل کمپنیوں نے ۲۰۰۳ء میں ۱۲۳ ارب ڈالر منافع کمایا جب کہ ۲۰۰۲ء میں ۶۸ ارب ڈالر منافع حاصل کیا ہے۔ اس کتاب کے مطابق امریکہ اپنے اس سرمایہ دارانہ نظام کو بڑھانے اور اس کی گرفت مضبوط کرنے کے لیے مشرق وسطیٰ کے تیل اور گیس کے ذخائر پر اپنی کمپنیوں کے ذریعے کنٹرول کر کے وہاں کی منڈیوں میں امریکی مصنوعات کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ اس سلسلہ میں مڈل ایسٹ فری ٹریڈ ایریا کے نام سے ایک آزاد تجارتی زون قائم کر رہا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ امریکہ عسکری اور معاشی غلبہ حاصل کر کے دنیا میں امن قائم رکھ سکے۔ اب پاکستان اور سعودیہ بھی امریکہ کے اس ایجنڈے کے پیروکار ہو گئے ہیں کہ دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کو فروغ ہو اور دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے اور ساری دنیا کے غریب اور نادار لوگ ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے جائیں۔ ورنہ یہ بات ہر صاحب عقل و خرد کی سمجھ سے باہر ہے کہ کوئی ملک اپنے اور غریب عوام کے سرمایہ سے بنے ہوئے اداروں کو یوں فروخت کر دے جو اسے ہر سال اربوں روپے کا منافع کما کر دے رہے ہوں جیسے پی ٹی سی ایل، حبیب بینک، مسلم کمرشل بینک، سٹیل ملز وغیرہ۔ یہ ادارے حکومت کے لیے بہت منافع بخش ہیں لیکن سرمایہ دارانہ نظام کو مضبوط کرنے کے لیے بڑی بے دردی سے انہیں فروخت کر دیا گیا۔

شراکت

اسلام کے ابتدائی دور میں تجارت کی مختلف قسمیں رائج تھیں ان میں شراکت اور مضاربت کے اصولوں پر بھی تجارت کی جاتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف شراکت کو پسند فرمایا بلکہ دوسروں کے ساتھ شراکت کی بنیاد پر کاروبار بھی کیا۔ شراکت ہے کیا؟ دو یا دو سے زیادہ افراد کسی کاروبار میں متعین سرمایہ کے ساتھ نفع کے حصول کے لیے اکٹھے ہوں اور کاروبار کے نفع نقصان میں پہلے سے طے شدہ نسبتوں کے ساتھ شریک ہوں۔

اسلام میں تجارت میں شراکت کا جواز:

سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت کے وقت تجارت کے بہت سے طریقے رائج تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں تمام جائز طریقوں کی موافقت فرما دی، پھر ان میں ان تمام طریقوں کی اصلاح فرما دی جو صداقت اور عدل وانصاف کے تقاضوں کے خلاف تھے اور ہر ایسا طریقہ جس میں نزاع یا فساد کی کوئی صورت پیدا ہو یا کسی ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے فریق کا سراسر نقصان ہو ان تمام طریقوں کو ناجائز فرما کر ان سے روک دیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے صنعت وتجارت اور زراعت کے جن طریقوں سے منع فرمایا ان میں ترامیم تجویز کیں، ان کے مطالعہ سے فقہائے کرام نے مصالح اور مفاسد کو متعین کیا جو کسی کاروبار کے جائز یا ناجائز ہونے کا باعث تھے۔ ان اسباب کا اطلاق دوسرے معاملات کے بارہ میں تحقیق کر کے ان کے جائز یا ناجائز ہونے کا تعین کرنے میں بھی مدد دیتا ہے لہٰذا کوئی ایسا طریقہ ہے جو سرکار دو عالم ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا اور آپ ﷺ نے اس طریقہ کو اختیار کیا، آپ ﷺ نے اس طریقہ کے بارہ میں اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا یا اس طریقے سے کسی شخص کو نہ روکا اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی یا ترمیم تجویز کی تو اسلام کی نگاہ میں وہ طریقہ جائز ہے۔ شراکت کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ جب اسلامی ریاست کے سربراہ تھے تو اس زمانہ میں شراکت اور مضاربت کے تجارتی

طریقے رائج تھے۔ آپ ﷺ کے عہد میں صحابہ کرام بھی ان طریقوں سے تجارت کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان طریقوں پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا، اس وجہ سے شراکت اور مضاربت دونوں شرعی طور پر تجارت کے جائز طریقے ہیں۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ سے مروی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ جب تک دو شرکاء میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ خیانت نہ کرے میں ان دونوں کا تیسرا ساتھی بن جاتا ہوں۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میں بازاری کاروبار کرتا ہوں اور میرا ایک شریک (Partner) مسجد میں نماز پڑھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شاید تیرے کاروبار کی برکت اسی کی وجہ سے ہے۔ (الحدیث)

سائب بن شریک کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں تجارت میں شرکت کی تھی جب مدینہ منورہ میں ان صاحب سے ملاقات ہوئی تو آپ ﷺ نے اس کا ذکر فرمایا اور اس شرکت کو پسندیدگی کے ساتھ یاد کیا۔ (مسند احمد [illegible])

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان حصہ داروں کے ساتھ ہوتا ہے جو ایمانداری سے کام لیں۔ ([illegible])

یہ تو نقلی دلائل تھے جبکہ عقلی لحاظ سے بھی شراکت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

(۱) اگر ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ ہے اور وہ اس سے تجارت اور کاروبار کر کے دس ہزار روپے کماتا ہے جبکہ دو افراد ایک ایک لاکھ روپیہ ڈال کر دو لاکھ سے کوئی کاروبار کریں گے تو ان کو منافع بھی زیادہ ہوگا اور کاروبار بھی بڑے پیمانے پر ہوگا اور ان کو کاروبار میں زیادہ سرمایہ فراہم کرنے میں بھی آسانی ہوگی۔

(۲) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے پاس سرمایہ موجود ہو لیکن کاروبار کرنے کی پوری صلاحیت اس میں موجود نہ ہو اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ اگر وہ اکیلا کاروبار کرے تو اپنے کاروبار کو بخوبی سرانجام نہ دے سکے، لہٰذا دوسرے فریق کی شراکت سے اس کے لیے کاروبار چلانا بہتر اور مفید ہوگا۔

(۳) موجودہ زمانے میں ایک آدمی تو معمولی کام بھی نہیں کر سکتا اگر دو آدمی کسی کاروبار میں شریک ہوں گے تو وہ تقسیم کار کر کے اپنے کاروبار کو بخوبی چلا سکیں گے جس سے

تعداد کی بھی بڑھتی اور کاروبار کی کامیابی کے امکانات بھی روشن ہوں گے۔

شراکت کے شرائط:

فقہاء نے شریعت اسلامیہ کی روشنی میں کاروباری شراکت کی کچھ شرائط بھی لکھی ہیں جن میں اہم شرائط درج ذیل ہیں۔

۱۔ باہمی رضامندی:

قرآن وسنت کے مطابق تجارت کے لئے بھی اور شراکت میں باہمی رضامندی ایک بنیادی شرط ہے۔

۲۔ فریقین کا بالغ ہونا:

معاہدہ شراکت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ فریقین بالغ ہوں کیونکہ نابالغ اور بچے کا معاہدہ قابل قبول نہیں ہوتا۔

۳۔ عاقل ہونا:

فریقین کا عمر کے لحاظ سے بالغ ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی لحاظ سے بھی بالغ (Mature) اور عاقل ہونا ضروری ہے تاکہ وہ کاروباری معاملات کو بخوبی سمجھ سکیں۔ مجنون اور بے عقل کا معاہدہ شراکت کوئی وزن نہیں رکھتا۔

۴۔ کاروبار کا جائز ہونا:

پھر جس کاروبار میں شراکت ہو رہی ہے وہ کاروبار بھی شریعت میں جائز ہو۔ حرام اشیاء اور منشیات یا دوسری ناجائز چیزوں کا کاروبار ویسے ہی شرعی طور پر ناجائز ہے لہذا اس میں شراکت بھی ناجائز ہے۔

۵۔ فریقین کے نفع کا پہلے سے تعین ہونا:

شراکت کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ فریقین کے نفع کا تعین بھی شراکت سے پہلے

طے ہو جائے تا کہ بعد میں کوئی نزاع اور جھگڑا پیدا نہ ہو۔

۶۔ نقصان کی ذمہ داری کا بھی تعین ہو:

کاروبار میں جس طرح نفع کا امکان ہوتا ہے اسی طرح نقصان کا امکان بھی ہوتا ہے۔ نقصان ہونے کی صورت میں فریقین اپنے اپنے سرمایہ کی شرح سے نقصان کو برداشت کریں گے۔

شراکت کی قسمیں:

فقہاء کے نزدیک شراکت کی کئی قسمیں ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ شراکت ملک:

یہ وہ شراکت ہے جس میں دو یا دو سے زائد افراد کسی شے یا جائیداد میں ملکیت کے حقوق رکھتے ہوں اور ملکیت کے حقوق کی بناء پر شریک ہوئے ہوں۔ یہ شرکت دو طرح سے ہو سکتی ہے جبری شرکت یعنی جس میں انسان کا اپنا اختیار نہیں ہوتا اور وہ دوسرے کے ساتھ شریک ہوتا ہے دوسری قسم اختیاری شرکت کی ہے جس میں ایک فریق دوسرے فریق کے ساتھ اپنے اختیار اور اپنی مرضی سے شریک ہوتا ہے۔

۲۔ شراکت عقود:

یہ وہ شراکت ہے جس میں دو فریق ایک دوسرے کے ساتھ معاہدہ کر کے شریک ہوتے ہیں۔ فقہاء اس کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں۔

(۱) شراکت مال (۲) شراکت ابدان (۳) شراکت وجوہ۔

پھر ان میں سے ہر ایک قسم کو پھر دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

(۱) شرکۃ المفاوضہ (۲) شرکۃ العنان۔

۱۔ شراکت مال:

اس شراکت میں دو یا دو سے زائد فریق معین مال کے ساتھ منافع کمانے کی غرض

سے ایک دوسرے کے ساتھ منافع کی نسبت طے کر کے شریک ہوتے ہیں اس کی جیسا بتایا گیا ہے دو اقسام ہیں۔(۱) شرکت مفاوضہ (۲) شرکت عنان۔

شرکت مفاوضہ:

شرکت مفاوضہ میں دو یا دو سے زائد فریق مساوی بنیادوں پر ایک دوسرے کے ساتھ شراکت کرتے ہیں۔ ان کی شرائط حسب ذیل ہیں۔

(۱) فریقین کا نقد سرمایہ مساوی ہو۔

(۲) ہر فریق دوسرے کا نمائندہ ہو۔

(۳) فریقین عاقل ہوں، پاگل اور نا سمجھ نہ ہوں۔

(۴) فریقین بالغ ہوں، نابالغ اور بچے نہ ہوں۔

(۵) آزاد ہوں غلام نہ ہوں۔

(۶) دونوں ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔

(۷) ہر فریق دوسرے فریق کی ذمہ داری پر اپنے معاملات اور عمل کیلئے جواب دہ ہو۔

(۸) نفع و نقصان مساوی بنیادوں پر تقسیم ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ شرکت کی ایک اختیاری شکل شرکت المفاوضہ ہے اس میں شرکاء اپنے تمام سرمایہ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوتے ہیں لیکن ان سرمایوں کا باہم مساوی ہونا ضروری ہے۔ خسارہ کی صورت میں شرکاء کی ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے۔ نفع کی صورت میں ہر شریک کو برابر برابر حصہ ملتا ہے۔ شرکت کی اس شکل کو صرف فقہ حنفی میں صحیح قرار دیا گیا ہے۔[۱] (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو بدائع الصنائع ۶/۵۸ بدایۃ المجتہد لابن رشد مالکی ۲/۲۵۴)

۲- شرکت عنان:

شرکت عنان میں دو یا دو سے زیادہ فریق ایک دوسرے کے ساتھ شراکت کا معاملہ غیر مساوی بنیاد پر کر سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں شرکت مفاوضہ کی طرح کڑی شرطیں نہیں ہیں مثلاً

(۱) فریقین کے سرمایہ کی جنس مختلف ہو سکتی ہیں۔

(۲) بچے اور بڑے، بالغ اور نابالغ کے درمیان شراکت ہو سکتی ہے۔

(۳) ان میں دونوں فریقوں کے مذہب کا یکساں ہونا ضروری نہیں، مسلمان اور کافر بھی شریک ہو سکتے ہیں۔

(۴) شراکت مال میں جو بنیادی استحقاق اور تصرف کے اختیارات ہوں گے وہ کاروبار کے معاملات میں حصہ لینے کی جنس اور شرحیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ سرمایہ کا مساوی اور یکساں ہونا ضروری نہیں۔

(۵) منافع کی تقسیم سرمایہ (Capital) کے تناسب سے نہیں بلکہ آپس میں طے شدہ شرحوں کے مطابق کی جاتی ہے۔

(۶) نقصان میں شراکت فریقین کے سرمایوں کی نسبت سے ہوگی۔

(ب) شراکت الاعمال:

شراکت کی یہ قسم دو یا دو سے زیادہ فریقوں کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ شراکت ہاتھوں سے کام کرنے والے کاریگروں کے درمیان ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کو شراکۃ الصنائع بھی کہتے ہیں جیسے درزی اور بڑھئی، رنگریز اور لوہار وغیرہ کے درمیان۔

اس شراکت کی بھی دو اقسام ہیں۔

(۱) شراکت مفاوضہ (۲) شراکت عنان

(ج) شراکت الوجوہ:

اس شراکت میں دو فریق ایک دوسرے کے ساتھ شراکت کا معاملہ اس طرح کرتے ہیں کہ ان میں سرمایہ کا عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ ایک فریق یا کمپنی اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتی ہے اور دوسرا فریق یا فرم اپنے اثر و رسوخ کی بنیاد پر ادھار مال خرید کر اسے مارکیٹ میں نقد فروخت کرتی ہے۔ کسی فرم یا ادارے کے ساتھ شراکت "شرکۃ الوجوہ" کہلاتی ہے۔ شوافع میں شراکت اعمال اور شراکت الوجوہ دونوں طرح کی شراکت جائز نہیں۔

۱۔ نفع کی تقسیم:

کاروبار میں نفع ہونے کی صورت میں وہ نفع مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھ کر فریقین میں تقسیم ہوگا۔

(۱) نفع کی تقسیم فریقین کے مابین طے شدہ نسبتوں کے حساب سے ہوگی اور ہر فریق کا حصہ فیصد یا نسبت کی صورت میں متعین کیا جائے گا اور کسی فریق کے لئے نفع میں کوئی رقم پہلے سے متعین نہیں کی جائے گی۔

(۲) نفع کی تقسیم میں فریقین کا سرمایہ، عملی شمولیت اور ذمہ داری کے پیش نظر نفع کی نسبت متعین کی جائے گی البتہ ان باتوں کو نظر انداز کر کے بھی نفع کی تقسیم کی جا سکتی ہے۔

(۳) مساوی سرمایہ کاری کے باوجود نفع کی نسبتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

(۴) حسابات کرتے وقت پہلے اصل سرمایہ علیحدہ کیا جائے گا۔ اس کے بعد فاضل رقم کو دیکھا جائے گا۔ اگر رقم بچی تو منافع اور اصل سرمایہ اگر پورا نہ ہو تو نقصان۔

(۵) مسلسل جاری کاروبار میں نقصانات کا ازالہ آئندہ ہونے والے منافع سے کیا جا سکتا ہے۔

(۶) کاروبار کے نفع کے حق دار اور نفع کے مالک اس وقت قرار پائیں گے جب اصل سرمایہ مالکان سرمایہ کو واپس مل جائے۔ مالکان کا اپنے سرمایہ پر قبضہ عملاً بھی ہو سکتا ہے اور قانوناً بھی۔

۲۔ نقصان کی ذمہ داری:

یہ تو منافع کی تقسیم کا معاملہ تھا لیکن کاروبار میں نقصان کا احتمال بھی ہو سکتا ہے اور نقصان کہتے ہیں اصل سرمایہ کے ڈوب جانے والے حصہ کو۔ نقصان کی ذمہ داری کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھے جائیں گے۔

(۱) فقہاء کے نزدیک نقصان ہمیشہ کاروبار میں لگے ہوئے سرمایہ کی نسبت سے تقسیم کیا

کردے۔ دو سے زیادہ افراد کی شراکت کی صورت میں دیگر فریق معاہدہ کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔

(۲) شراکتی کاروبار ایک مقررہ مدت کیلئے بھی کیا جا سکتا ہے۔

(۳) کسی ایک شریک کاروبار کے مرنے کی صورت میں شراکت ختم ہو جاتی ہے البتہ دو سے زیادہ افراد کی شراکت کی صورت میں اسے جاری بھی رکھا جا سکتا ہے۔

شراکت کی منسوخی:

جس طرح شراکت کا معاہدہ قائم ہوتا ہے اسی طرح مندرجہ ذیل صورتوں میں شراکت کا معاہدہ منسوخ بھی ہو جاتا ہے۔

(۱) فریقین میں سے ایک فریق کاروبار میں سے علیحدگی اختیار کرلے۔

(۲) فریقین میں سے ایک کی موت واقع ہو جائے۔

(۳) ایک یا دونوں فریق شراکت ذہنی طور پر معذور ہو جائیں مثلاً بالکل پاگل ہو جائیں یا کسی حادثہ میں اپنی یادداشت کھو بیٹھیں۔

(۴) کسی ایک فریق یا فریقین کو اپنے حصہ کے قانونی استعمال سے روک دیا جائے۔

موجودہ دور میں کاروبار اکثر وبیشتر لمبے عرصہ تک چلتے ہیں اور ان کی منسوخی درج ذیل وجوہ کی بناء پر ہوتی ہے۔

(۱) حکومت کاروبار کو سرکاری ملکیت میں لے لے یعنی نیشنلائز کرے۔

(۲) حکومت اس کاروبار کو جبراً روک دے۔

(۳) کسی عدالتی فیصلہ یا عدالتی کارروائی کی بنا پر کاروبار کو روک دیا جائے۔

(۴) کاروباری شرکاء کی اکثریت کو کاروبار کو ختم کرنا چاہے یا معاہدہ شراکت کو منسوخ کرنا چاہے۔

شراکت اور صنعتی کاروبار:

ہماری فقہ کی کتابوں میں صنعتی کاروبار کے سلسلہ میں کوئی مباحث نہیں ملتیں

کیونکہ اس زمانے میں اتنے بڑے بڑے صنعتی یونٹس نہیں ہوتے تھے۔ یہ سارے صنعتی یونٹس صنعتی انقلاب کے بعد وجود میں آئے لیکن اسلام میں کاروبار کی ہر وہ شکل جو کسی شخص کے لیے انفرادی طور پر جائز ہے اس میں شراکت بھی جائز ہے۔ جب عام کاروبار میں شراکت جائز ہے تو صنعتی کاروبار کی تقسیم و ترویج بھی شراکت کی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ

(۱) متعدد فقہائے کرام کے نزدیک صنعتی کاروبار بھی دوسری انسانی ضروریات کی طرح فرض کفایہ ہے لہٰذا جن اعمال کی انجام دہی کی ضرورت ہے اس میں اشتراک عمل ضروری نہ بھی ہو تو جائز ہے۔

(۲) موجودہ زمانے میں تجارت اور صنعتی کاروبار کیلئے بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے جس کی فراہمی ایک فرد کیلئے ممکن نہیں ہوتی لہٰذا سرمایہ دار لوگ آپس میں تعاون کر کے شراکت کی بنیاد پر سرمایہ حاصل کرتے ہیں۔

(۳) غیر سودی معیشت میں سرمایہ کے حصول کا ذریعہ شراکت یا مضاربت ہے۔ اس لیے بھی صنعتی یونٹس میں شراکت جائز ہے۔

اس طرح حصص کے ذریعہ کسی ایسے صنعتی کاروبار میں شراکت جائز ہے جو حرام اشیاء اور خدمات کی پیداوار اور لین دین نہیں کرتا۔ غیر سودی بینک کاری کا مضبوط ڈھانچہ شراکت اور مضاربت کی بنیاد پر استوار کیا جا سکتا ہے۔

مضاربت

اپنے سرمایہ کو نفع آور کاروبار اور تجارت میں لگانے کی ایک شکل مضاربت ہے۔

مضاربت کا لفظ "ضرب" سے مشتق ہے جس کے معنی سفر کے ہیں۔ تجارت میں عموماً سفر در پیش ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ لفظ "ضرب فی الارض" سے ماخوذ ہے جس سے مراد ہے زمین کے طول و عرض میں سفر کرتا ہے جس کا اطلاق مضاربت کے معاملہ میں مضارب کی رب المال کے سرمایہ کے ساتھ جدوجہد پر ہوتا ہے۔ مضاربت کے لیے دوسری اصطلاح "قراض" اور "مقارضہ" استعمال ہوتی ہے جو قرض سے ماخوذ ہے۔ قراضہ کا معنی ہے کاٹنا۔ مضاربت میں اس سے مراد یہ ہے کہ ایک سرمایہ دار آمدنی سے بچا بچا کر (کاٹ کاٹ کر) کچھ سرمایہ جمع کرتا ہے اور اسے کاروبار میں لگاتا ہے جب کہ مضارب منافع میں سے حصہ "رب المال" (صاحب سرمایہ) کو دیتا ہے۔ فقہ حنفی اور فقہ حنبلی میں ایسے کاروبار کیلئے "مضاربت" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جب کہ فقہ شافعی اور فقہ مالکی میں "قراض" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

اس کی تعریف فقہاء کے نزدیک یہ ہے کہ مالک اپنے سرمایہ کو کسی کاروباری شخص کے سپرد کر دے۔ صاحب سرمایہ صرف سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا کاروباری فریق اس سرمایہ کے ذریعہ کاروبار چلاتا ہے۔ یہ مضاربت کی سادہ ترین شکل ہے جس میں ایک شریک صرف سرمایہ فراہم کرتا ہے جب کہ دوسرا فریق صرف کاروباری جدوجہد کرتا ہے۔

کاروبار کے اس طریقہ سے اگر کاروبار میں نفع ہوگا تو دونوں فریق اس نفع میں طے شدہ نسبتوں کے مطابق حصہ دار ہوں گے اور اگر کاروبار میں نقصان ہوگا تو اس مالی نقصان کو سرمایہ لگانے والا برداشت کرے گا۔ کاروباری فریق کو یہ نقصان ہوگا کہ اس کی جدوجہد اور تگ و دو اور کوشش بے ثمر گئی اور اسے اس کا کوئی صلہ اور فائدہ نہ ملا۔ کسی فریق کے حق میں بہر صورت کسی متعین رقم کی ادائیگی کا معاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں فریقوں میں سے

بھی قبول کی۔

مضاربت کی اہمیت احادیث سے:

احادیث میں مضاربت کو پسند کیا گیا ہے اور اس کے بارہ کتابوں میں بہت سی احادیث منقول ہیں جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

(۱) سرکار دو عالم ﷺ نے نبوت کے اعلان سے قبل سیدہ خدیجہ سلام اللہ علیہا کے مال کے ساتھ مضاربت کے تحت تجارت کی جس کا ذکر ہم نے گزشتہ صفحات میں کیا ہے۔ (مبسوط)

(۲) سیدنا عباس رضی اللہ عنہ مخصوص شرائط کے ساتھ مضاربت پر کاروبار کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ (مبسوط)

(۳) سیدنا حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ انہی شرائط کے ساتھ مضاربت کرتے تھے۔

(۴) سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ مضاربت میں برکت ہے۔

(۵) سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی مضاربت کیا کرتے تھے۔ (مبسوط)

(۶) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرید بن خلیدہ کے ساتھ مضاربت کی۔

(۷) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے بھی مضاربت کے اصولوں پر کاروبار کے لیے رقم دی۔

(۸) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دو صاحبزادے عبداللہؓ اور عبیداللہؓ فوجی خدمات کے سلسلہ میں عراق گئے۔ واپسی پر بصرہ کے گورنر سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے انہیں کچھ رقم دی جو مدینہ پہنچ کر امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے حوالے کرنی تھی۔ اس رقم سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادوں نے مال تجارت خریدا اور مدینہ طیبہ پہنچ کر نفع پر فروخت کر دیا اور اصل رقم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جمع کروا دی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: "کیا اسی طرح تمام سپاہیوں کو رقم دی گئی تھی یا صرف تمہیں دی گئی کیوں کہ تم خلیفہ کے بیٹے تھے؟" انہوں نے کہا صرف ہمیں دی گئی۔ آپ نے ان کو تمام رقم نفع سمیت بیت

صورت میں اپنے مسائل کو دین کی بنیاد پر حل نہیں کر سکا۔ عدالت نے سود کو ختم کیا تھا لیکن حکومت نے اپیل کروا کر سپریم کورٹ سے اس فیصلے کو منسوخ کروا دیا اور اب گزشتہ نصف صدی تک کوئی امید نہیں کہ کوئی ایسی حکومت آئے جو سود کو سرکاری طور پر حرام قرار دے۔

مضاربت کے احکام:

سرمایہ دار ایک مضارب کے ساتھ مل کر جو مال حوالے کرتا ہے شریعت میں اس کے کچھ احکام ہیں۔

(۱) مضارب کو مال حوالے کیے جانے کے بعد کاروبار شروع کرنے سے پہلے تک اس سرمایہ کی حیثیت امانت کی ہے اور امانت کی حفاظت مضارب کی ذمہ داری ہے اور جب صاحب سرمایہ اس رقم کو واپس مانگے تو اس کی واپسی بھی مضارب کی ذمہ داری ہے البتہ مال ضائع ہو جانے کی صورت میں مضارب پر ضمان لازم نہیں ہوگا۔

(۲) کاروبار شروع کیے جانے کے بعد مضارب کی حیثیت صاحب سرمایہ کے وکیل کی ہو جاتی ہے۔

(۳) کاروبار میں منافع ہونے کی صورت میں مضارب کی حیثیت مالی معاہدہ کے شریک کی ہو جاتی ہے اور ہر شریک کاروبار کو معینہ اور طے شدہ نسبت سے منافع کی تقسیم کی جائے گی۔

(۴) اگر کسی سبب سے معاہدہ مضاربت منسوخ ہو جائے تو اس صورت میں یہ معاہدہ مضاربت نہیں بلکہ معاہدہ روزگار کی شکل اختیار کرے گا اور مضارب کی حیثیت ملازم کی ہو جائے گی۔ نفع یا نقصان صاحب سرمایہ کا ہوگا جبکہ مضارب کو اس کی اجرت ملے گی۔

(۵) اگر مضارب معاہدہ مضاربت کی شرائط میں سے کسی شرط کو تسلیم نہ کرے تو اس کی حیثیت غاصب کی ہوگی اور اس پر اصل سرمایہ کی واپسی کی ذمہ داری ہوگی۔

(۶) اگر معاہدہ مضاربت کی ایک شرط یہ ہو کہ سارا منافع مضارب کو ملے گا تو یہ معاہدہ مضاربت نہیں بلکہ مضارب کی حیثیت مقروض کی ہوگی۔ اور یہ معاملہ قرض کا معاملہ ہوگا نفع نقصان کی ذمہ داری اسی کی اپنی ہوگی اور سرمایہ کے ضیاع اور ہلاکت کی صورت میں سرمایہ کی صاحب سرمایہ کو واپسی اس کی ذمہ داری ہوگی۔

(۷) اگر شرط یہ ہو کہ سارا منافع مالک کا ہوگا تو یہ معاملہ عقد البضاعۃ کا ہوگا۔

ارکان مضاربت:

مضاربت کے ارکان دو ہیں۔

(۱) ایجاب (۲) قبول

اس کے لیے الفاظ کی ضرورت ہے جو دونوں فریقین کے معاہدہ مضاربت پر رضامندی کو ظاہر کریں مثلاً ایک فریق کہتا ہے کہ یہ مال لو اور اس سے مضاربت کرو میں اپنا یہ مال مضاربت کیلئے لو اس پر جو نفع ہوگا وہ ہم آدھا آدھا یا جس نسبت سے طے ہو تقسیم کر لیں گے اور جواب میں مضارب کہے کہ میں نے یہ سرمایہ لے لیا یا میں اس معاہدہ پر راضی ہوں یا میں نے آپ کی یہ پیشکش قبول کی۔

مضاربت کی شرائط:

مضاربت کے معاہدہ کی فقہاء نے کچھ شرائط لکھی ہیں جن میں سے اہم حسب ذیل ہیں۔

(۱) سرمایہ نقدی یعنی سونے چاندی کی صورت میں ہونا چاہیے۔ مال تجارت کے ساتھ مضاربت جائز نہیں۔ نقدی یعنی سونا چاندی ضروری ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عروض التجارۃ (یعنی مال تجارت) کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے قدر سرمایہ اور منافع کی مقدار بھی تبدیل ہو جاتی ہے جیسے ایک شخص کہتا ہے کہ یہ کپاس یا کپڑا ایک ہزار روپے کا ہے یہ کپڑا لو اور اسے مضاربت کی بناء پر فروخت کرو۔ یہ معاہدہ درست نہیں ہے البتہ اگر مضارب سے کہا جائے کہ یہ مال تجارت و

صاحب سرمایہ نے مضارب سے قرض لے رکھا ہو تو ایسے سرمایہ پر مضاربت درست نہیں۔

مضارب کے حقوق:

اسلام میں جس طرح صاحب سرمایہ کے حقوق ہیں اسی طرح مضارب کے بھی حقوق اور فرائض ہیں ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

(۱) مضارب کیلئے ضروری ہے کہ وہ باہمی طے شدہ شرائط کی پابندی کرے۔

(۲) مضارب کسی دوسرے شخص کے ساتھ بھی مضاربت کا معاملہ کرسکتا ہے مگر یہ کہ اس کو ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔

(۳) کوئی تیسرا شخص مضارب کی امداد و خدمات کرسکتا ہے تاکہ وہ کاروبار کو بہتر طور پر چلا سکے۔

(۴) اکثر فقہاء کا کہنا ہے کہ صاحب سرمایہ مضارب کے ساتھ کاروبار میں عملی حصہ نہیں لے سکتا کیونکہ اس سے مضارب کے اختیارات محدود ہو جاتے ہیں اور وہ کھل کر کام نہیں کرسکتا جبکہ بعض شوافع اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ صاحب سرمایہ مضاربت میں عملی حصہ بھی لے سکتا ہے۔ دور جدید کے بڑے پیمانے کے کاروبار میں جن میں فیصلوں کا اختیار فرد واحد کے بجائے ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کے پاس ہوتا ہے صاحب سرمایہ کا مضاربت کے کاروبار میں عملی شرکت کرنا جائز ہے۔

(۵) مضاربت کے معاہدہ میں مضارب کی طرف سے سرمایہ کی حفاظت و واپسی کی ضمانت دینے سے مضاربت کا معاہدہ فاسد ہو جاتا ہے البتہ مضارب کی طرف سے پوری ذمہ داری سے کام کرنے کی ضمانت لی جا سکتی ہے۔

(۶) مضارب کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ کاروباری خرید و فروخت کرسکتا ہے اشیاء وغیرہ کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتا ہے کسی فرد کے ساتھ ان کا معاملہ کرسکتا ہے مگر یہ کہ اس کو ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔

مضاربت میں نفع ونقصان:

مضاربت میں نفع ونقصان کے احکام یہ ہیں:

(۱) شراکت میں نقصان سرمایہ کے تناسب سے سرمایہ کے مالکان کو برداشت کرنا ہوتا ہے چونکہ مضاربت میں سرمایہ ایک فریق کا ہوتا ہے اور محنت دوسرے فریق کی ہوتی ہے لہٰذا نقصان کی ذمہ داری بھی اسی صاحب سرمایہ پر ہوتی ہے یعنی کاروبار میں جو بھی نقصان ہوگا وہ صاحب سرمایہ کو برداشت کرنا ہوگا۔

(۲) نفع کی تقسیم مضاربت کے معاہدہ میں طے شدہ نسبتوں سے ہوگی۔ کسی بھی فریق کے لیے کوئی متعین رقم پیشگی طے نہیں کی جاسکتی۔

(۳) حنفی فقہ کے مطابق سرمایہ صاحب سرمایہ کے حوالہ کرنے سے پہلے منافع کی تقسیم درست نہیں ہے۔

(۴) مسلسل کاروبار میں تقسیمات کی صورت نفع سے کی جاتی رہے گی یہاں تک کہ کاروبار ختم کرکے حسابات کرلیے جائیں۔

(۵) فریقین کے نفع ونقصان کی مقداروں کی تعیین کاروبار ختم ہونے پر کی جائے گی۔

(۶) کاروبار میں نفع کے حق دار دو فریق ہیں۔ لیکن اس وقت تک فریقین نے جب اصل سرمایہ صاحب سرمایہ کو واپس نہ کیا ہو وہ اپنے سرمایہ ہی کا حقدار ہوتا ہے جیسے اگر ایک فریق کی موت کے ساتھ مضاربت کا معاہدہ ختم ہوجاتا ہے تو واپسی کے انتظام اور نفع کی تقسیم کے لیے کافی ہوگا کہ اصل سرمایہ اس کے نفع سے پہلے ادا کر دیا جائے۔ یہ قانونی ضابطہ ہے۔

(۷) نفع سرمایہ میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ لیکن منافع نہ ہونے کی صورت میں مضارب کی محنت کا ازالہ ضروری ہے۔

(۸) کاروبار میں کسی قسم کے اختیارات خاص یا مختلف تصرفات اور معاملات کی اجازت یا کسی قسم کی پابندیاں باہمی رضامندی سے عائد کی جاسکتی ہیں۔

موجودہ دور میں مضاربت:

موجودہ دور میں بینک کاری اور سرمایہ کاری کے اداروں کے معاملات نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ان اداروں کے طریقہ کار اور سرمایہ کاری اکثر و بیشتر سودی معاملات کے گرد گھومتے ہیں جبکہ سود کی لعنت میں مبتلا ہیں جس پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جنگ کا اعلان کیا ہے۔ اسی وجہ سے مسلم مفکرین و ماہرین معاشیات اس بات کے خواہاں ہیں کہ ان اداروں کی تشکیل اسلامی تعلیمات کے مطابق کی جائے۔ ان کی یہ کوشش تمام بینک کاری کی صنعت تک محدود نہیں بلکہ ہر اس ادارے کے لیے کوشش جاری ہیں جو لوگوں کی بچتوں (Savings) کو کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح کے اداروں میں سرمایہ کاری کے لیے مالی وسائل کے حصول اور کام کے حوالے سے انہیں دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

مشترکہ مالی وسائل رکھنے والے اداروں میں مضاربت کے اصولوں پر کاروبار مندرجہ ذیل طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔

(ا) اپنے کاروبار میں مضارب ایک سے زیادہ سرمایہ کاروں سے سرمایہ وصول کر سکتا ہے، تو مروجہ مضاربت میں اس قسم کے مشترکہ کاروبار کی اجازت دیتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے سرمایہ کے حصول کے دو طریقے جائز ہیں۔

(۱) سرمایہ کاری کے لیے سرمایہ کا حصول کاروبار شروع کرنے سے پہلے کیا جاتا ہے۔

(۲) پہلے سے موجود رقم سے سرمایہ کاری شروع کی جائے اور بعد میں سرمایہ حاصل کیا جائے۔

البتہ مضارب کے لیے ضروری ہے کہ جن جن افراد یا اداروں سے اس نے سرمایہ حاصل کیا ہے ان سب کی اجازت سے مشترکہ کاروبار میں اسے لگائے اور دوسرے یہ کہ سرمایہ کاری مناسب طریقے سے کرے۔

(ب) مضاربت کی دوسری صورت پہلے سے جاری مضاربت کے کاروبار کو مسلسل

باعث تسکین بھی ہے چنانچہ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ نے بھی اس کو امداد باہمی میں شمار کیا ہے فرماتے ہیں:

> ''امداد باہمی کی چند اقسام ہیں ان میں ایک ''مضاربت'' ہے اور وہ یہ ہے کہ مال ایک شخص کا ہو اور محنت دوسرے فرد کی اور طرفین کی رضامندی کے ساتھ نفع دونوں کے درمیان ہو۔'' (حجۃ اللہ البالغۃ ۲: ۱۱۶)

مضاربت کے اس طریقے سے سرمایہ دار کا سرمایہ ''لعنت'' سے ''رحمت'' بن جائے گا اور معاشرہ میں نا قابل گزر تفریق نہیں ہوگی اور نہ قابل نفرت سرمایہ دار اور تجارت دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتی چلی جائے گی اور معاشرہ روز بروز معاشی اور تجارتی ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جائے گا اور جب بیروزگاری کے منہ میں آسانی نوالہ پہنچے گا تو پیٹ اور ذہن کی تمام بیماریاں ختم ہو جائیں گی۔

متعلق ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مال کثیر حاجت سے بہت زائد
جمع رکھنا بہتر نہ ہوا، گو زکوٰۃ بھی ادا کر دی جاوے اور غیر مستحسن ہونا اس
سے بحیثیت مجموعی ثابت ہے کیونکہ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے
بلکہ بعض صحابہ جیسے ابوذرؓ وغیرہ نے ضرورت سے زائد رکھنے کو
حرام ہی فرمایا۔ بہرکیف غیر مناسب اور خلاف اولیٰ ہونے میں تو
کسی کو کلام نہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ زائد عن الحاجۃ سے اس کی تو
کوئی غرض متعلق نہیں اور دوسروں کی ملک ’’من وجہ‘‘ اس میں ہوتی ہے
تو گویا شخص مذکور ’’من وجہ‘‘ مال غیر پر قابض و متصرف ہے اور اس کا
مال بعینہ بالقسمت کو مقصود کرنا چاہیے۔ یہاں بھی اسی تقسیم کی
قصد ہے کہ کل دنیا کی قسمت تمام موجودین کا مملوک سمجھا جاتا ہے مگر بوجہ
ضرورت و حصول انتفاع ’’بقدر حاجت‘‘ ہر کوئی مال مذکور سے متمتع
ہو سکتا ہے پس حاجت سے زائد جو رکھنا چاہے اس کا حال آپ کو بھی
معلوم ہے کہ کیا ہونا چاہیے (یعنی خائن شمار ہوگا)۔‘‘

(بیانات نادرہ ص ۲۶۸)

۳۔ تقسیم دولت:

تقسیم دولت میں بھی اسلام ایسے طریقوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے جن سے
کسی کی حق تلفی نہ ہو لیکن وہ مساوی طور پر اس بات کو تسلیم کرتا ہے۔ ہر شخص جو صلاحیتیں
لے کر پیدا ہوا ہے اس لیے ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق ہی ملے گا۔ البتہ عدم
صلاحیت یا کم صلاحیت کی وجہ سے جو لوگ محروم رہ جائیں یا کم حصہ پائیں ان کا حق ان
لوگوں کی دولت پر قائم رہتا ہے جو زیادہ صلاحیت کی وجہ سے اپنی ضروریات سے زیادہ
دولت کماتے ہیں اس طرح اسلام بغیر کسی کشمکش کے ایسے راستے پیدا کرتا ہے جن کے
ذریعے زیادہ دولت مندوں کی مقدار خود بخود کم دولت والے حصوں تک پہنچ جاتی ہے اور انہیں بھی

کی اجازت دیتی ہے۔ اس حق کے پیچھے بنیادی تصور یہ ہے کہ تمام صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں۔ لہٰذا جس کو صلاحیتیں زیادہ ملی ہوں اور وہ ان کی وجہ سے زیادہ دولت کمانے کے قابل ہو گیا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مال کا کچھ حصہ کم صلاحیت کی وجہ سے کم پانے والے لوگوں تک منتقل کرے، یہ محض تحفہ یا خیرات کے طور پر نہیں بلکہ حق کے طور پر ہے۔

تقسیم دولت کے معاملے میں اسلام کے ہاں ایک اور اصول بھی پیش نظر رہتا ہے وہ یہ کہ قومی آمدنی مختلف عاملین پیدائش کی مشترکہ مساعی اور جدوجہد سے وجود میں آتی ہے اور یہی قومی آمدنی ان عوامل کے مابین ان کے معاوضوں کی شکل میں تقسیم ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اگرچہ پیدائش دولت کا عمل معاشی ترقی اور فروغ کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے لیکن پھر بھی معیشت کے پائیدار استحکام اور معاشرے کے افراد کی حقیقی خوشحالی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ پیدا شدہ دولت کی تقسیم ایسے انداز میں ہو کہ وسائل دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر نہ رہ جائیں اور معاشرہ کا ہر فرد بہتر طریقے اور معقول معیار سے اپنی زندگی کی ضروریات پوری کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے عاملین پیدائش کے معاوضوں کے تعین میں منصفانہ اصول بنائے جائیں تاکہ ہر عامل ترقی و مسرت کے ساتھ معاشی عمل کو رواں دواں رکھنے میں اپنا کردار نہایت اچھے طریقے سے ادا کر سکے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ جس معیشت میں غیر منصفانہ تقسیم کیا ہوا اس میں اس بات کا امکان موجود رہتا ہے کہ چند افراد کے اندر دولت کا بہاؤ ضرورت سے زیادہ ایک جانب زیادہ تر ہو جائے اس وجہ سے اسلامی نظام میں دولت کی تقسیم کو بڑی اہمیت دی گئی ہے بلکہ پوری معیشت کی بنیاد ہی اس شعبہ کو مستحکم، منضبط اور عدل و انصاف پر مبنی بنانے پر رکھی گئی ہے اس لیے اس مسئلہ کو محض رسد و طلب کی قوتوں کے سپرد نہیں کر دیا گیا بلکہ معاشرہ اور فرد دونوں کی معاشی فلاح کے حصول کو اصل ہدف قرار دیا گیا ہے اور اس بات کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے کہ تقسیم دولت کا نظام عدل و احسان کی بنیاد پر ہو اور معاشرے کے ہر فرد کو وسائل زندگی اور ضروریات زندگی باوقار اور معیاری طریقے پر میسر ہوں اور اس کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔

موجودہ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت وتجارت میں سرمایہ دار اپنے سرمایہ اور اس سے حاصل ہونے والے نفع ومنافع کی وجہ سے اپنے کاروبار کو وسیع سے وسیع تر کرتے جاتے ہیں اور گروپ آف انڈسٹریز بناتے ہیں جس کی وجہ سے غریب اور متوسط طبقات کی دولت ان کے ہاتھوں سے نکل کر سرمایہ دار طبقے کے پاس اکٹھی ہوتی جاتی ہے اور اس طرح دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہوتا چلا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں آج کے سرمایہ داروں کو Magnet یعنی مقناطیس کہا جاتا ہے یعنی یہی خصوصیت ہوان کو یہ کرتے ہیں جن سے غریبوں اور متوسط طبقوں کی دولت کھنچ کھنچ کر ان کی تجوریوں میں چلی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متوسط طبقہ کے لوگ اور تنخواہ دار ملازمین اور غریب لوگ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں جس سے نہ صرف ملک کا معاشی نظام ابتر ہوتا ہے بلکہ قوم کا اخلاقی نظام بھی روبہ زوال ہو جاتا ہے اور معاشرے میں فحاشی اور بے حیائی کا عفریت ناچنے لگتا ہے کیونکہ چند ہاتھوں میں دولت کا ارتکاز بے حیائی اور اخلاقی دیوالیہ پن کا باعث بنتا ہے۔ اسی وجہ سے اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان جائز ذرائع سے حاصل کردہ دولت کو اپنی ذاتی ضروریات خریدنے پر صرف کرے یا کسی جائز کاروبار میں لگائے جس میں لوگوں کو ملازمت ملے یا پھر غرباء اور مساکین اور ضرورت مند حضرات کو دے دے تاکہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس بارے میں کہ اسلامی نظام معاش کی بنیاد کائنات انسانی کی رفع حاجات وضروریات اور انفرادی واجتماعی احتیاجات کی تکمیل پر قائم ہے نہ کہ دولت مندوں اور سرمایہ داروں کے درمیان نفع کی دوڑ کا میدان بننے کے لیے۔ چنانچہ مولانا مرحوم فرماتے ہیں

> "(اس نظام معیشت میں) یقیناً زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہوں گے کیونکہ سعی وکسب کے بغیر کوئی مومن زندہ ہی نہیں رہ سکتا لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور بھی ہوگا اور اس لیے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی اتنی ہی زیادہ جماعت بہ حیثیت جماعت کے خوش حال ہوتی جائے گی اور مستحق افراد

"جو لوگ سونے اور چاندی کے ذخیرے جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو خوشخبری سنا دو دردناک عذاب کا جس روز جب سونے اور چاندی کے ان ذخیروں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر ان (سرمایہ داروں) کی پیشانیوں، کروٹوں اور پشتوں کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا) یہ وہ ہے جو تم نے خاص اپنے لیے جوڑا تھا اب چکھو اس کو جو تم نے جوڑ کر رکھا تھا۔"

ایک اور مقام پر انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ [آل عمران: ۱۸۰]

"وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس (مال) میں جو انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دیا ہے وہ ہرگز نہ سمجھیں کہ ان کا یہ فعل ان کے لیے بھلائی کی بات ہے بلکہ یہ ان کے لیے شر اور برائی کی بات ہے۔ عنقریب قیامت کے روز یہ مال جس کے لیے وہ بخل کرتے، ان کے گلوں میں (عذاب کا) طوق بنا کر پہنایا جائے گا۔"

قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝ كَلَّا لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ﴾

[الھمزہ: ۱-۴]

"ہر طعنہ دینے والے غیبت کرنے والے کے لیے تباہی ہے جس نے مال جمع کیا اور اس کو گن گن کر رکھا وہ گمان کرتا ہے کہ وہ (مال) اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا ہرگز نہیں وہ چورا چورا کرنے والی میں ضرور

سرمایہ میں پا سکیں۔ یہ اموال محض دولت مندوں کے الٹ پھیر میں پڑ کر ان کی مخصوص جاگیریں بن کر نہ رہ جائیں جس سے سرمایہ دار موٹے ہوتے جائیں اور غریب فاقوں مریں۔" (قوانین قرآنی ص ۱۶۵)

اسلام طبقاتی امتیاز کا قائل نہیں:

اسلامی نظام معیشت میں ذرائع پیداوار کی تبدیلی سے انسان کی فطرت اور اس کے سوچنے کے طریقے نہیں بدلا جاتے۔ اسی لیے اس کی معاشیات کا مدار طبقاتی تصور پر نہیں رکھا گیا۔ اسلام انسانی سوسائٹی کو "اعلیٰ بورژوا" "ادنیٰ بورژوا" "اعلیٰ پرولتاریہ" اور "ادنیٰ پرولتاریہ" "سرمایہ دار" اور "غیر سرمایہ دار" وغیرہ کے طبقات میں تقسیم نہیں کرتا اس میں لوگوں کی دولت تقسیم کرنے، طبقاتی امتیازات کو ابھارنے، ان کو باہمی تصادم میں مجبور کرنے، انہیں لڑانے اور حق دلانے کے بجائے آپس میں الفت و محبت کے جذبات کو فروغ دینے اور خود بخود "حق بحقدار رسید" پر عمل پیرا ہونے کے اصول پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ چھوٹی بڑی حیثیتوں کو اسلام ختم نہیں کرتا اس لیے کہ اس کے بغیر ایک دوسرے سے کام لینے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ جو نظام اس اختلاف مراتب اور فرق مدارج کا نظری طور پر انکار کرتا ہے اس کے اہل بھی عملاً اس کو قائم کرتے ہیں اور اس سے بدتر شکلیں قائم کرتے ہیں جس میں ایک جبری محنت کا بھیانک نظریہ بھی ہے۔

انسان خدا کا نائب اور خلیفہ:

اسلامی نظام میں انسان محض ایک بہترین پیداواری طاقت ہی نہیں ہے بلکہ وہ زمین میں خدا کا نائب اور خلیفہ بھی ہے۔ وہ زمین میں پیداواری قوتوں کو ایک خاص مقصد کی خاطر استعمال کرنے والا ہے۔ چنانچہ اسلام کے اقتصادی نظام پر اس تصور کا اثر یہ پڑتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بیل، بھینس، گھوڑے یا کل انجن، موٹر کار یا سائیکل کی طرح محض سرمایہ وصول کرنے کی چیز نہیں سمجھتا بلکہ وہ اپنی اخلاقی صلاحیتوں کی بنا پر اپنے آپ کو ان مادی چیزوں کے استعمال کا ایک بہتر دنیوی اور اخروی اجر کے لیے حق دار خیال کرتا ہے اور یہی

سمجھتے ہوئے ہر کام کرتا ہے۔

اسلام توازن کا علم بردار:

اسلام کے اقتصادی اصولوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام ایک بیچ کی راہ پر گامزن ہے وہ نہ تو فرد کو سرمایہ دارانہ نظام کی طرح ہر قسم کی کھلی چھٹی دیتا ہے کہ جس طرح چاہے کمائے اور جس طرح چاہے صرف اور تقسیم کرے۔ اور نہ وہ اشتراکی نظام معیشت کی طرح فرد کو مشین کا ایک پرزہ بنا کر رکھ دیتا ہے۔ وہ نہ تو یہ کہتا ہے کہ تمام جائیداد کا مالک انسان ہے اور ہر فرد جس طرح چاہے اس میں تصرف کر سکتا ہے۔ اور نہ وہ ملک کی تمام جائیداد کا مالک اسٹیٹ کو قرار دے کر انفرادی سرمایہ داری کے بجائے ریاستی چور بازاری اور ریاستی ارتکاز دولت کا رُخ دیتا ہے۔ اسلام دراصل تمام نظام ہائے زندگی کے محاسن کا ایک مرکب ہے جس سے ہٹ کر آگے اور پیچھے سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ نہیں۔

آج کل ہر لیڈر اور راہنما بلکہ سربراہ مملکت عوام کو دھوکہ دینے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ "زندگی کا معیار بلند کرو" ہر وزیر، ہر لیڈر اور ہر سربراہ جلسہ اور مجلس میں دن رات اسی فقرہ کو دہراتا ہے کہ ہمارے تمام ترقیاتی منصوبوں کا مقصد اور ہماری صبح و شام کی تگ و دو کا مقصد صرف اور صرف یہی ہے کہ عوام کی زندگی کا معیار اونچا اور بلند ہو۔ اس فقرہ کو سن کر عوام الناس کے دل شاداں و فرحاں ہو جاتے ہیں۔ ان کا وقتی طور پر سیروں خون بڑھ جاتا ہے ان کی سوکھی رگوں میں تری آ جاتی ہے اور امنگوں اور تمناؤں کی مرجھائی ہوئی کلیوں میں تازگی اور شادابی آ جاتی ہے۔ نفسیاتی طور پر اس فقرہ کا عوام پر اثر ضرور پڑتا ہے اور وقتی طور پر انہیں خوشی و مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن یہ فقرہ جہاں بھولے بھالے اور سیدھے سادے عوام کو خوش کرنے کے لیے بولا جاتا ہے وہاں وزراء عالی مقام اس فقرہ کو بول کر اپنا معیار زندگی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور عوام کے اذہان میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم بھی تمہاری طرح غریب ہیں لیکن ہم پہلے تمہارا معیار

کے متوالے اور شیدائی، خوش حال لوگ اس روشنی جب بے دردی پر بے شمار دولت خرچ کرتے ہیں، اور یہ نہیں سوچتے کہ جو نعمت اللہ نے فراہم کی ہے اس کو ادا کریں۔ اس طرز معاشرت اور کی تہذیب و فیشن کی بنیادیں اس زمانہ میں بھی اتنی گہری ہیں کہ خاندان کے خاندان ختم ہو گئے مگر یہ تہذیب اور فیشن ختم نہ ہوا، اور آج تک اس تہذیب کا تسلسل چلا آرہا ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام کو ہماری بدحالی سے انسیت اور فاقہ مستی سے محبت نہیں۔ اسلام کے نزدیک خوش حالی اور دولت مندی کے حصول کے لیے کوشش کرنا قابل اعتراض نہیں ہے لیکن اس کے لیے ذرائع جائز ہونے چاہئیں۔ ناجائز ذرائع اور حرام طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کو اسلام "مال غیر متقوم" تصور کرتا ہے۔ آپ اپنی قابلیت اور صلاحیت کو کام میں لائیں اور خوب محنت کریں جس سے قوم اور ملت کو فائدہ پہنچے اور قوم اور ملک کی دولت میں ترقی اور اضافہ ہو۔ اس کے صلہ میں جتنی بھی دولت آپ کو حاصل ہو وہ باعث مسرت ہے۔ لیکن اخلاقی اور انسانی سماج کی کمزوری یہ ہے کہ ایک وہ طبقہ ہوتا ہے جو خواب دیکھتا ہے محلوں، بڑی بڑی بلڈنگوں اور فیکٹریوں کے اور محنت اتنی بھی نہیں کرتا کہ جھونپڑی کی ایک چھوٹی سی تیار کر سکے۔ ہم کام سے جان چراتے ہیں اور خواہش یہ رکھتے ہیں کہ دولت اپنے گھر کی لونڈی ہو۔ ہم میں سے اکثر و بیشتر کی آمدنی کے جائز ذرائع جب ان کی خواہشات کو پورا نہیں کر سکتے تو پھر وہ ناجائز ذرائع سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ لوگوں کی جیبوں پر ہاتھ مارتے ہیں، شریف اور محنت کش شہریوں کے گھروں میں نقب لگا کر سرراہ اسلحہ کی نوک پر ان کی گاڑھے پسینے کی کمائی اڑا لیتے ہیں۔ اگر دو چار ہم جیسے ساتھی مل جائیں تو سرراہ ڈاکے ڈالتے ہیں۔ اگرچہ قانون کی دھمکی ان کے کانوں میں پڑتی رہتی ہے لیکن برصغیر پاک و ہند میں تو قانون کی دھمکی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہاں تو قانون موم کی ناک ہے، دوسرے ان کا تصور یہ ہوتا ہے

ساقیا امروز کی فکر، فردا کس نے دیکھا

وزراء کے بیان اونچے معیار زندگی کی ترغیب کی یہ برکت ہے کہ رشوت لینے والوں اور سمگلنگ کرنے والوں کے دلوں سے اپنے جرم کی غیرت نکل گئی ہے اور لوگوں

کے دلوں سے بھی ان کی نفرت کافور ہو گئی ہے بلکہ بسا اوقات ہمدردی ہوتی ہے کیوں کہ زندگی کا معیار جو ہم نے اختیار کر لیا ہے بلکہ بلند معیار زندگی کی ترغیب دے ہمیں اختیار کرایا گیا ہے، اس کو نبھانے کے لیے فاضل آمدنی کو ضروری قرار دیا جاتا ہے اور لینے والے کو معذور سمجھا جاتا ہے۔ جب ہم اونچے معیار کی زندگی کا راگ الاپتے ہیں تو گویا ہم اشارہ کرتے ہیں ۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز